VOLUME: 9
ISSN: 2454-4035
ISSUE: 1-6
JANUARY-JUNE 2022

انوار تحقیق

مدیران اعزازی

پروفیسر صاحبزادہ صولت علی خان

پروفیسر ای اے حیدری

مدیر اعلی

سید الیاس احمد مدنی

ANWAR-E-TAHQEEQ January-June 2022

VOLUME: 9
ISSN: 2454-4035
ISSUE: 1-6
JANUARY-JUNE 2022

ANWAR-E-TAHQEEQ

(Multilingual & Multidisciplinary Peer Reviewed Refereed Monthly Magazine from Qila-e-Golconda, Hyderabad, Deccan)

HONORARY EDITORS

PROFESSOR SAHEBZADA SAULAT ALI KHAN

PROFESSOR E. A. HAIDARI

CHIEF EDITOR

SYED ILIYAS AHMAD MADNI

قلعہ گولکنڈہ، حیدرآباد، دکن سے ماہانہ ادبی مجلّہ..................

انوار تحقیق

جلد۔۹ شمارہ۔ا تا۶ جنوری۔جون ۲۰۲۲ء

زرتعاون:۔فی شمارہ:۔۱۰۰روپے سالانہ:۔۱۰۰۰روپے

نگراں:۔**سید عادل احمد**، محکمہ آثار قدیمہ، اسٹیٹ میوزیم، حیدرآباد، تلنگانہ

مدیران اعزازی:

صاحبزادہ پروفیسر صولت علی خان

پروفیسر ای اے حیدری

ایڈیٹر:۔**سید الیاس احمد مدنی**

پتہ:۔ 9/10/389، نیم باولی مسجد، کٹھورا ہاؤس، گولکنڈہ قلعہ، حیدرآباد، تلنگانہ۔008 500

موبایل نمبر:۔09966647580،09667489786 ای میل:۔anwaretahqeeq@gmail.com

مجلس ادارت

پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید، علی گڑھ

پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی۔مانو, حیدرآباد

ڈاکٹر محمد عقیل۔بی ایچ یو، وارانسی

ڈاکٹر محمد احتشام الدین، علی گڑھ

ڈاکٹر محمد قمر عالم۔ اے ایم یو، علی گڑھ

ڈاکٹر محمد توصیف خان کاکر۔اے ایم یو۔علی گڑھ

ڈاکٹر احمد نوید یاسر، اے ایم یو۔علی گڑھ

شیخ عبدالرحیم۔جماعت اسلامی ہند۔حیدرآباد، دکن

تبع علی خان۔ایڈیٹر اردو خبر ڈاٹ ان، حیدرآباد، دکن

ریویو کمیٹی

پروفیسر مسعود انور علوی۔علی گڑھ

پروفیسر عمر کمال الدین۔لکھنؤ

پروفیسر عزیز بانو۔حیدرآباد

پی انورادھا ریڈی۔انٹیک، تلنگانہ اسٹیٹ، حیدرآباد۔چاپٹر

ڈاکٹر زرینہ پروین۔ڈائرکٹر آف آرکائیوز، حیدرآباد، دکن

ڈاکٹر سیدہ عصمت جہان۔مانو حیدرآباد

ڈاکٹر ایم اے نعیم، حیدرآباد، دکن

جناب ایم اے غفار، استاد خطاطی، ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد

کشور جھن جھن والا، ماہر مسکوکات، ممبئی

امر بیر سنگھ۔ماہر مسکوکات۔حیدرآباد

فہرست مندرجات

	عنوان	مقالہ نگار	صفحہ
	اداریہ		۳
۱	لکھنؤ میں غالب کی کلیات نظم فارسی: طباعت......	پروفیسر عمر کمال الدین کاکوروی	۴
۲	تذکرۃ الکرام: مشائخ سلسلۂ قادریہ وارثیہ مجیبیہ......	پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید	۱۷
۳	خوشیوں کا باغ: علامتی بیانیہ اور استعاراتی فضا......	ڈاکٹر مبشرہ صدف	۲۷
۴	مکتوبات حضرت شاہ مجا قلندر: تعارف وافادیت	محمد عاصم	۳۵
۵	فارسی تذکرہ نگاری: متقدمین ومتأخرین تذکروں......	ادیبا خانم	۴۱

اداریہ

تحقیق دراصل جستجوئے حقیقت، سعیِ پیہم اور کاوشِ مسلسل کا وہ بامقصد عمل ہے جس کے ذریعے انسان پردۂ خفا میں پوشیدہ حقائق کو منصۂ شہود پر لانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ محض جمعِ معلومات نہیں بلکہ تنقیحِ افکار، تہذیبِ فکر اور بالیدگیِ شعور کا آئینہ دار ہے، جو ذہنِ انسانی کو قالبِ جمود سے رہائی عطا کر کے وسعتِ نظر اور عمقِ نگاہ سے ہم کنار کرتا ہے۔ لغوی اعتبار سے تحقیق کے معنی اثباتِ حق، توضیحِ حقیقت اور تمیزِ حق و باطل کے ہیں، جب کہ اصطلاحاً یہ ایک منظّم، مربوط اور باقاعدہ علمی کاوش ہے جس میں تتبعِ مصادر، تقابلِ دلائل اور تنقیدی محاکمہ کے ذریعے کسی مسئلے کی کنہ و ماہیت تک رسائی حاصل کی جاتی ہے۔ اس عمل میں محقق اپنے ذہن کو تعصب و تقلید کی بیڑیوں سے آزاد رکھ کر دیانتِ فکری اور اعتدالِ نظر کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔

تحقیق کی اہمیت اس امر سے واضح ہوتی ہے کہ یہی عمل علم کو تعطل و جمود سے بچا کر حرکت و ارتقا سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ سائنسی انکشافات، فلسفیانہ افکار، سماجی نظریات اور ادبی تنقید — سب تحقیق ہی کے مرہونِ منت ہیں۔ تحقیق انسان کو تقلیدِ جامد کے حصار سے نکال کر تفکرِ آزاد، شعورِ آگاہ اور بصیرتِ عمیق عطا کرتی ہے، جس کے باعث وہ محض مقلد نہیں بلکہ صاحبِ نظر بن جاتا ہے۔ تحقیقی عمل میں انتخابِ موضوع، فراہمیِ مواد، جانچ پڑتال، تجزیہ و تنقیح اور استخراجِ نتائج کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ معتبر مآخذ و مصادر سے استفادہ، مواد کی باریک بینی سے چھان بین اور دلائل کی عقلی و منطقی ترتیب تحقیق کو استحکام عطا کرتی ہے اور نتائج کو معقول، مستند اور قابلِ اعتبار بناتی ہے۔

اردو ادب میں تحقیق نے زبان و ادب کو تاریخی شعور، تہذیبی وقار اور فکری استحکام سے ہم کنار کیا ہے۔ قدیم متون کی تدوین و تصحیح، نادر مخطوطات کی بازیافت، تذکروں کی ترتیب اور ادبی تحریکات کا تنقیدی جائزہ اردو تحقیق کی درخشاں مثالیں ہیں، جن کے ذریعے ادب کی اصل صورت اور فکری جہات آشکار ہوئیں۔ الغرض تحقیق چراغِ راہِ علم ہے جو جہالت کی تاریکیِ شب میں صبحِ آگہی کی نوید دیتی ہے۔ یہ انسان میں جرأتِ سوال، ذوقِ جستجو اور صداقت پسندی پیدا کرتی ہے اور اسے فکری بالیدگی کے اس مقام تک پہنچاتی ہے جہاں علم محض معلومات نہیں رہتا بلکہ دانشِ معتبر کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

پروفیسر عمر کمال الدین کاکوروی
صدر شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

لکھنؤ میں غالبؔ کی کلیات نظم فارسی: طباعت کی روداد

نجم الدولہ، دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں متخلص بہ غالبؔ معروف بہ مرزا نوشہ ایسی عہد آفریں شخصیت کا نام ہے جس کے مخالف و موافق دونوں اس سے متاثر نظر آتے ہیں۔ شاعری ہو یا نثر نگاری، مکتوب نگاری ہو یا تنقید غالبؔ ہر جگہ غالب نظر آتے ہیں۔ زیر نظر مقالہ لکھنؤ میں ان کی ''کلیات نظم فارسی'' کی طباعت کی روداد پر مشتمل ہے جو ۱۸۶۳ء میں مطبع نول کشور میں حلیہ طبع سے پیراستہ ہوا۔ غالبؔ کی لکھنؤ میں کلیات نظم فارسی کی اشاعت کی شدید خواہش، منشی نول کشور سے ان کے مراسم، اہل تعلق اور شاگردوں کے خطوط میں اس کے شائع ہونے کی اطلاع دیتے ہوئے ان کا جوش و خروش، اشاعت کے سلسلہ میں ضیاء الدین خان نیرؔ ورخشاںؔ کو لکھے گئے خط میں ان کی منتیں اور سماجتیں نیز دیوان کے ضائع ہو جانے کی صورت میں اس کی تلافی کے سلسلہ میں ان کو مطمئن کرنے کی کوشش کی حکایت نہایت دلچسپ بھی ہے اور اس امر کی غمّاز بھی کہ وہ اپنی مقصد بر آری کے لئے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ اشاعت میں تاخیر پر ان کی مایوسی بھری بے چینی، کلیات کی خریداری کے لئے رقم کا انتظام، کلیات کا اشہار اور کلیات سے متعلق دیگر باتیں یقیناً غالبؔ نوازوں کے علم میں ہوں گی لیکن مقالہ نگار کی یہ کوشش ہے کہ ان جزئیات کو ایجاز و اختصار سے کام لیتے ہوئے اس طرح بیان کر دیا جائے تا کہ تمام قاری اس کا لطف لے سکیں۔

کلیدواژہ: غالبؔ، کلیات نظم فارسی، اودھ اخبار، مطبع نول کشور، لکھنؤ

۸/اگست ۱۸۶۱ء کو اپنے عزیز شاگرد میر مہدی مجروحؔ کے نام تحریر غالبؔ کے خط کی یہ عبارت یقیناً غالبؔ کے چاہنے والوں کو ان کے عمدہ اور مشہور ترین اشعار کی طرح ورد زبان ہوگی۔

> ''۔۔۔۔ہائے لکھنؤ کے چھاپے خانے نے کہ جس کا دیوان چھاپا، حسن
> خط سے الفاظ کو چمکا دیا۔ دلی پر اور اس کے پانی پر اور اس کے چھاپے پر لعنت،
> صاحب دیوان کو ایسے یاد کرتا ہے جیسے کتّے کو آواز دے۔''(۱)

مندرجہ بالا خط میں غالبؔ نے لکھنؤ کے چھاپے خانے (بہ ظن غالب مطبع نول کشور) سے شائع ہونے والی تصانیف کی درست و نفیس کتابت نیز معیاری و جاذب نظر طباعت وغیرہ کی جس انداز میں مدح سرائی کی ہے اور اس کے مقابلہ میں دلی کے مطابع کو اپنے مخصوص

انداز میں جس طرح ہدف ملامت بنایا ہے۔اس سے اور اس قبیل کے دوسرے مکاتیب کے مطالعہ سے بہ آسانی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی تصانیف کی طباعت میں نہ صرف اس کی کتابت میں نفاست وصحت پر خصوصی توجہ مبذول کرتے تھے بلکہ آرائش وزیبائش کی جزئیات پر بہت زیادہ زور دیتے تھے اور مطابع کے ذمہ داروں کو ان اہم امور پر نہ صرف عمدہ مشورہ دیتے رہتے تھے بلکہ متواتر یاددہانی بھی کراتے رہتے تھے تاکہ اشاعت کے مرحلے سے گذرنے سے پہلے ہی اغلاط واسقام دور کردئے جائیں۔مثال کے طور پر منشی شیونرائن متخلص بہ آرام کے نام مورخہ ۱۳؍اگست ۱۸۵۸ء کو مرقومہ ایک مکتوب کی عبارت کا اقتباس پیش کیا جارہا ہے جس میں وہ اپنی تصنیف ''دستنبو'' کی اشاعت کے سلسلہ میں ضروری ہدایتیں اس انداز میں دے رہے ہیں:

''۔۔۔۔۔میں نہیں چاہتا کہ دو (۲) جز یا چار (۴) جز کی کتاب ہو، چھ (۶) جز سے کم نہ ہو، مسطر گیارہ (۱۱) سطر کا ہو مگر حاشیہ تین (۳) طرف سے بڑا رہے شیرازے کی طرف کم ہو۔۔۔۔۔۔کاغذ ''شیورام پوری'' ہو خیر مگر سفیدو مہرہ کیا ہوا اور لعاب دار ہو، پھر یہ ہو کہ حاشیے پر جو لغات کے معنی لکھے جائیں تو اس کی طرز تحریر اور تقسیم دل پسند اور نظر فریب ہو، حاشیے کی قلم بہ نسبت متن کے قلم کے خفی ہو۔''(۲)

طباعت کے فنّی پہلوؤں پر مکمل دسترس، کتابت سے اشاعت تک کے سارے مراحل پر گہری نگاہ، کاغذ کے مختلف اقسام اور ان کی درجہ بندی سے مکمل واقفیت رکھنے والے شخص یعنی غالبؔ نے لکھنؤ کے اشاعتی اداروں کو جو سند معیار واعتبار عطا کی تھی وہ محض مدّاحی نہیں تھی بلکہ لکھنؤ کی عمدہ اور درست کتابت نیز معیاری طباعت کے سلسلہ میں اعتراف حقیقت تھا۔ساتھ ہی ساتھ اس امر کا اندازہ بھی ہوجاتا ہے کہ ان کے دل میں مطبع نول کشور سے اپنی تصانیف کی اشاعت کی شدید خواہش انہیں مخصوص خوبیوں کے سبب سر اٹھا رہی تھی جس کی تصدیق سطور آئندہ میں ہوجائے گی۔بارے مطبع کا کچھ بیاں ہوجائے:

نکل باغ قیصر (۳) سے مطبع میں آ
تماشا کلوں کا میں دیکھوں ذرا
حقیقت میں ہے قدرت کردگار
نہاں خانۂ غیب سے آشکار
جسے دیکھ کر عقل بھی دنگ ہے

وہ گلشن کا تختہ ہر اک سنگ ہے
کلیں وہ کہ دیکھے سے ہو بے کلی
پری بھی پرستاں سے آئے چلی
وہ چلتی ہر اک کل ہے اس ڈھنگ سے
پری بن کے نکلے ورق سنگ سے
کہیں ''کیمیائے سعادت'' چھپی
کہیں ''ہفت پیکر'' برابر لگی
کسی سنگ پر ''بوستان'' کی بہار
کسی جا پہ پھولی ہے ''باغ و بہار''
معانی و منطق چہ علم و ادب
عجم اور عرب کی کتب سب کی سب
چہ تصنیف فردوسی و انوری
تواریخ جمشید و اسکندری
کتاب ایسی عالم میں ہے کون سی
جو مطبع میں یاں کے نہ ہووے چھپی
سوا اس کے چھپتا ہے اخبار بھی
وہ خبریں کہ جھوٹی نہ ہوویں کبھی
یہ چھپتا مہینہ میں ہے ہفتہ وار
نکلتا ہے ہر ماہ میں چار بار (۴)

مطبع اخبار اودھ جو آگے چل کر مطبع نول کشور یا نول کشور پریس کے نام سے مشہور ہوا، اس کا رسمی طور پر قیام ۲۳ رنومبر ۱۸۵۸ء کو راجہ مان سنگھ کی کوٹھی واقع حضرت گنج لکھنؤ میں عمل میں آیا۔(۵)

ظاہر ہے کہ کتابوں کی اشاعت اور ''اودھ اخبار'' کے نکلنے کا سلسلہ کچھ مدت کے بعد ہی شروع ہو سکا ہوگا اس سلسلہ میں مشہور محقق

پروفیسر حنیف نقوی لکھتے ہیں:

''اخبار کے چوتھے اور پانچویں سال کی فائلوں کے مطالعہ سے حاصل اطلاعات کی روشنی میں یہ قیاس لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا پہلا شمارہ چہارشنبہ مورخہ ۵ /جنوری ۱۸۵۹ء کو منظر عام پر آیا ہوگا''۔(۶)

''اودھ اخبار'' کے سال اشاعت کی تصدیق مشہور جرمن مستشرق گارساں دتاسی کے دسمبر ۱۸۶۶ء کے خطبہ کی مندرجہ ذیل عبارت سے بھی ہو جاتی ہے:

''یہ اخبار پچھلے سات سال سے نہایت کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ یہ اخبار ہفتہ وار ہے اور چہارشنبہ کے روز شائع ہوتا ہے، شروع شروع میں اس میں صرف چار صفحے ہوا کرتے تھے اور وہ بھی چھوٹی تقطیع پر، پھر چھ ہوئے اور پھر سولہ اور اب وہ اڑتالیس صفحات پر مشتمل ہوتا ہے، پہلے کے مقابلے میں اس کی تقطیع بھی بڑی ہوگئی ہے میرے خیال میں اس سے زیادہ ضخیم اخبار ہندوستان بھر میں اور کوئی نہیں ہے''۔(۷)

اس سلسلہ میں پروفیسر نورالحسن ہاشمی کا یہ بیان کہ:

''اخبار ۲۶ /نومبر ۱۸۵۸ء سے شائع ہونا شروع ہوا۔۔۔۔اور ہر چہار شنبہ کو شائع ہوتا تھا''۔(۸)

دو وجوہات کی بنا پر نا قابل قبول ہے پہلی یہ کہ مطبع نول کشور کے قیام یعنی ۲۳ /نومبر کے صرف تین دن بعد اخبار نکلنا ناممکن ہے ۔دوسری یہ کہ ۱۸۵۸ء کی تقویم سے یہ اطلاع فراہم ہوتی ہے کہ ۲۶ /نومبر کو جمعہ کا دن تھا جب کہ پروفیسر موصوف اشاعت کا دن چہارشنبہ لکھ رہے ہیں اس بابت پروفیسر نقوی کا بیان درست نظر آتا ہے کیونکہ باعتبار تقویم ۵ /جنوری ۱۸۵۹ء کو چہارشنبہ کا دن تھا۔ بہر حال اشاعت کی حتمی تاریخ کی مختلف روایتوں سے قطع نظر اور اس سلسلہ میں غیر ضروری تفصیلات سے اجتناب کرتے ہوئے اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہ اخبار اپنے مشتملات کی بنا پر اردو صحافت میں ایک نئے عہد کے نقیب ہونے کے ساتھ ساتھ مطبع نول کشور میں چھپنے والی تصانیف کے اشتہار کا بھی کام کرتا تھا۔

غالبؔ اور منشی نول کشور کے تعارف کا ذریعہ ''اودھ اخبار'' ہی تھا جس کا حوالہ منشی شیونرائن آرام کو مورخہ ۱۳ /نومبر ۱۸۵۹ء کو لکھے

ہوئے ان کے خط میں ملتا ہے۔اس غائبانہ تعارف کے بعد نول کشور اور غالبؔ سے براہ راست تعلقات قائم ہونے کا علم غالبؔ کے مورخہ ۱۸/جولائی ۱۸۶۰ء کو تحریر اس خط سے بھی ہوتا ہے جسے انھوں نے منشی نول کشور کے خط کے جواب میں تحریر کیا تھا۔اس خط کے مطالعہ سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس تعلق کے قائم ہونے میں شاگرد غالبؔ میاں داد خاں سیاحؔ ذریعہ بنے ہوں گے کیونکہ اسی مکتوب میں ''بہ اقبال نشان میاں دادخاں سیاحؔ دعامی فرستم''(۹) کا جملہ اس بات کا غماز ہے کہ مکتوب الیہ یعنی منشی نول کشور اپنے مکتوب میں ان کا ذکر کر چکے تھے اور سیاحؔ ان دنوں لکھنؤ میں منشی نول کشور کے مہمان تھے اور اس سے قبل وہ (سیاحؔ) دلی میں قیام کر کے غالبؔ کی شاگردی اختیار کر چکے تھے۔

مرزا غالبؔ اور منشی نول کشور کے تعلقات رفتہ رفتہ مستحکم ہوتے گئے اور وہ غالبؔ کو ''اودھ اخبار'' مفت بھیجنے لگے۔غالبؔ بھی سال بھر کے اڑتالیس (۴۸) ٹکٹ ان کو بھیج دیتے تھے۔(۱۰)

بخوف طوالت غالب اور منشی نول کشور کے درمیان تحریر شدہ خطوط اور جوابی خطوط کا متن درج نہیں کیا جا رہا ہے کیونکہ راقم السطور کا اصل مقصد کلیات نظم فارسی کی اشاعت سے متعلق اطلاعات فراہم کرنا ہے۔

غالبؔ کا فارسی کلام ۱۸۳۵ء میں ''مے خانۂ آرزو سرانجام'' کے نام سے مرتب ہو چکا تھا اور ۱۸۴۵ء میں نواب ضیاءالدین خاں نیرؔ ورخشاںؔ کی صحت و ترتیب کے ساتھ مطبع دارالسلام دہلی میں زیور طبع سے آراستہ ہوا تھا۔(۱۱)

غالب اس کے دوسرے اڈیشن کو ''کلیات نظم'' کے نام سے شائع کرنا چاہتے تھے اس سلسلہ میں میر مہدی مجروحؔ کو جولائی ۱۸۶۱ء میں تحریر کے مکتوب میں یوں لکھتے ہیں:

> ''کلیات نظم فارسی چھاپنے کی تدبیر ہو رہی ہے اگر ڈول بندھ گیا تو وہ بھی چھاپا جائے گا۔۔۔اگر مقدور مساعدت کرے گا تو میں بے شرکت غیر اس کو چھپواؤں گا''۔(۱۲)

اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت تک کلیات کی طباعت کی کوئی سبیل نہیں ہوئی تھی۔غالبؔ کے شاگرد میاں داد خاں سیاحؔ بھی اپنے استاد کی کلیات نظم کے صاف ستھرے اڈیشن کی طباعت کی خواہش رکھتے تھے۔قرین قیاس ہے کہ اس سلسلہ میں انہوں نے بھی اپنے طور پر کوشش کی ہوگی۔بعد میں ''کلیات نظم فارسی'' اور ''قاطع برہان'' مطبع نول کشور سے شائع ہوئیں۔غالبؔ سید بدرالدین متخلص بہ کاشفؔ کو تحریر ایک خط میں ان کی طباعت کی تفصیلات کو ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں:

> ''۔۔۔۱۸۶۲ء یعنی سال گذشتہ ''قاطع برہان'' چھپی، پچاس (۵۰) جلدیں میں نے مول لیں۔۔۔فارسی کا دیوان بیس (۲۰) پچیس (۲۵) برس

کا عرصہ ہوا جب چھپا تھا پھر نہیں چھپا مگر ہاں سال گذشتہ میں منشی نول کشور نے شہاب الدین خاں کو لکھ کر کلیات فارسی کو جو ضیاء الدین خاں نے غدر کے بعد بڑی محنت سے جمع کیا تھا وہ منگا لیا اور چھاپنا شروع کیا وہ پچاس جزو ہیں یعنی کوئی مصرع میرا اس سے خارج نہیں، (۱۳) اب سنا ہے کہ وہ چھپ کر تمام ہوگیا ہے۔ روپے کی فکر میں ہوں ہاتھ آجائے تو پینسٹھ (۶۵) بھیج کر بیس (۲۰) جلدیں منگوالوں''۔(۱۴)

غالبؔ نے ''کلیات نظم فارسی'' کی درست اور اغلاط و اسقام سے پاک طباعت کے لئے اس نسخہ کا انتخاب کیا جو نواب ضیاء الدین خاں نیّرؔ ورخشاںؔ نے نہایت دقت نظر سے مرتب کیا تھا اور وہ اسے جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے اور اسے کسی کو دینا گوارا نہیں کر سکتے تھے۔غالبؔ کو اس نسخہ کا علم تھا اور نیّرؔ کے اس نسخہ سے والہانہ تعلق کا اندازہ بھی، اس لئے انہوں نے اس کی فراہمی کے لئے ان کو جو خط تحریر کیا اس میں التجا بھی تھی اور اس کے ضائع ہوجانے پر اس کی تلافی کا وعدہ بھی۔غالبؔ کے اس خط کا متن ملاحظہ ہو جس کے ایک ایک حرف سے غالبؔ کی اس نسخہ کی فراہمی کے سلسلہ میں شدید خواہش کا اظہار ہوتا ہے:

''جناب قبلہ وکعبہ آپ کو دیوان دینے میں تامل کیوں ہے؟ روز آپ کے مطالعہ میں نہیں رہتا کہ بغیر اس کو دیکھے آپ کو کھانا نہ ہضم ہوتا ہو، یہ بھی نہیں پھر بھی کیوں نہیں دیتے؟ ایک جلد ہزار بن جائے ،میرا کلام شہرت پائے ،میرا دل خوش ہو۔تمہاری تعریف کا قصیدہ (۱۵) اہل عالم دیکھیں ،تمہارے بھائی کی تعریف کی نثر سب کی نظر سے گذرے اتنے فوائد کیا تھوڑے ہیں؟ رہا کتاب کے تلف ہونے کا اندیشہ، یہ خفقان ہے، کتاب کیوں تلف ہوگی، احیانا اگر ایسا ہوا اور دلی لکھنؤ کی عرض راہ میں ڈاک لٹ گئی تو میں فوراً بہ سبیل ڈاک رام پور جاؤں گا اور نواب فخر الدین (۱۶) مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان تم کو لا کر دوں گا۔اگر یہ کہتے ہو کہ اب وہاں سے لے کر بھیج دوں، وہ یہ کہیں گے کہ وہیں سے کیوں نہیں بھیجتے؟ ہاں یہ لکھوں کہ نواب ضیاء الدین خاں صاحب نہیں دیتے تو کیا وہ جواب میں نہیں کہہ سکتے کہ جب وہ تمہارے بھائی اور

قریب ہوکر نہیں دیتے تو میں اتنی دور سے کیوں دوں؟ اگر تم یہ کہتے ہو کہ تفضّل (۱۷) سے لے کر بھیج دو، اگر وہ نہ دیں تو میں کیا کروں؟ اگر دیں تو میرے کس کام کا؟ پہلے تو ناتمام، پھر ناقص، بعض بعض قصائد اس میں سے اور کے نام کر دئے گئے ہیں اور اس میں اسی ممدوح سابق کے نام پر ہیں۔شہاب الدین خاں (۱۸) کا دیوان جو یوسف مرزا (۱۹) لے گیا ہے اس میں یہ دونوں قباحتیں موجود، تیسری یہ کہ سراسر غلط، ہر شعر غلط، ہر مصرعہ غلط، یہ کام تمہاری مدد کے بغیر انجام نہیں پائے گا اور تمہارا کچھ نقصان نہیں، ہاں احتمال نقصان وہ بھی از روئے وسوسہ و وہم، اس صورت میں میں تلافی کا کفیل، جیسا کہ اوپر لکھ آیا ہوں۔ بہر حال راضی ہو جاؤ اور مجھ کو لکھو تو میں طالب (اشارہ منشی نول کشور کی طرف ہے) کو اطلاع دوں اور طلب اس کی جب دوبارہ ہو تو کتاب بھیج دوں۔رحم وکرم کا طالب۔غالبؔ۔(۲۰)

نیرؔ کا مذکورہ بالا دیوان عالمی شہرت یافتہ کتب خانہ رضا لائبریری رامپور کے لوہارو کلیکشن میں موجود ہے جس کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کاتب نے بھی اس دیوان سے استفادہ کرنے میں نہایت احتیاط سے کام لیا اور نسخہ کو کسی قسم کا کوئی ضرر نہیں پہنچا۔اشتہار کلیات نظم فارسی غالبؔ مطبوعہ ''اخبار اودھ'' یکم جنوری ۱۸۶۳ء

ایک بشارت نئی سنو ہم سے

گوہر آب دار لو ہم سے

''ایسا مژدہ سناتے ہیں کہ کسی نے سنا ہی نہیں، وہ سامان کرتے ہیں کہاب تک ہوا ہی نہیں، مرحبا کہئے شاہد شیریں کار آیا ہے، مبارک ہو یوسف سر بازار آیا ہے، عزیز ہر دل ہے، دل بری میں کامل ہے، جب مشتاق دو چار ہوں گے، نقد تمنا سے خریدا ہوں گے، پردہ میں جمال کیا دکھایئے، اب نقاب چہرۂ سخن سے اٹھایئے، آویزہ گوش جہاں ہو، نزدیک و دور عیاں ہو، کہ نواب مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ دہلوی کا فارسی کلام مطبوع ہوا چاہتا ہے، نقش ونگار اس دل آرام

رنگین ادا کا عنقریب شروع ہوا چاہتا ہے، اقسام سخن پر مشتمل ہے۔ ہر ایک شعر فرد کامل ہے۔ عالی مضامین قصائد لا جواب، رنگین غزلیں انتخاب کہ انہیں دیکھ کر ظہیر (۲۱) کا کمال بھول جایئے، نظیری (۲۲) کی شوکت کبھی خیال میں نہ لایئے، مثنوی کی جادو بیانی میں جانے گفتگو نہیں، سحر حلال زلالی (۲۳) کی اس کے سامنے آبرو نہیں، رباعیوں کو پیکر سخن کے اربع عناصر کہئے، آب دار قطعات کو قطعات جواہر کہئے، ہر بیت شاہد ماہ سیمائے معنی کا گھر ہے۔ ہر مصرعہ قد موزوں سے بڑھ کر ہے، دس ہزار چار سو کئی اشعار ہیں کہ سب سلک گوہر شاہوار ہیں، خدا کے فضل سے نسخہ بھی وہ صحیح و درست بڑے کتب خانہ کا ہاتھ آیا، جس کو نواب ضیاء الدین خاں بہادر دہلوی نے جدو جہد تمام سے جمع فرمایا، مقبول آفاق کو تعریف کی حاجت نہیں، آفتاب کی صفات بیان کرنے کی ضرورت نہیں، ناظم کی بے مثالی آشکار ہے، عالم کو ان کی استادی کا اقرار ہے، اس زمانے میں سحبان ثانی (۲۴) ہیں، جواب انوری (۲۵) و خاقانی (۲۶) ہیں۔ ہر نکتہ ان کے قلم اختر کا اوج کمال ہے جو سخن زبان سے نکلا سحر حلال ہے، ایسی نادر چیز کہاں میسر آتی ہے، کس خوش نصیب کی یہ امید بر آتی ہے، دیکھئے ہم در نایاب کے ڈھیر لگائے دیتے ہیں، موتی کوڑیوں کے دام لٹائے دیتے ہیں۔سب کتاب تقریباً چالیس جزو میں چھپے گی، بعض مقام مناسب پر تصویر مصنف کھنچے گی، شروع طبع میں قیمت بھیجنے والے ۳/۴ (تین روپے چار آنے) کو پائیں گے، چھپ چکنے کے بعد پورے صہ/ (پانچ روپے) مقرر ہو جائیں گے، غالباً اہل ہنر سنتے ہی اہتزاز میں آئیں گے، چھپنے تو دو ہاتھوں ہاتھ اٹھا لے جائیں گے، اشتہار دینے کا یہ سبب ہے، صرف اتنا ہی مطلب ہے کہ درخواست بھیجنے والوں کو اطمینان یکسر رہے گا، پہلے ان کا استحقاق مدنظر رہے گا، اگر ابھی سے طلب گار ہوں کمی قیمت کے حصہ دار ہوں'' ۔(۲۷)

بخوف طوالت اس کے بعد وقتاً فوقتاً چھپنے والے اشتہارات سے صرف نظر کیا جار ہا ہے۔اپنی تصانیف میں نفاست ونظافت کولازمی جزو سمجھنے والے غالب کی کسی تصنیف کوشائع کرنے کے سلسلے میں منشی نول کشور جیسے مردم شناس اور غالب کے مداح نے ''کلیات نظم فارسی'' کی کتابت، تصحیح اور طباعت کے جملہ مراحل کوخوب سے خوب تر انداز میں انجام دینے کے لئے کیا کیا اہتمام نہ کیا ہوگا ؟ عمدہ، درست اور غلطیوں سے پاک کتابت نیز ددل فریب اور دیدہ زیب طباعت کے لئے اپنے مطبع کے لائق ترین کاتبوں،مشاق وتجربہ کار مصححوں اور تزئین کاروں کومنتخب کیا ہوگا،لیکن ابھی صرف ساٹھ صفحات کی طباعت مکمل ہو پائی تھی کہ کاتب اپنی کسی خانگی مصروفیت کی وجہ سے گھر چلا گیا اور مصحح مولوی ہادی علی اشکؔ (۲۸) علیل ہو گئے،کلیات کے شائع ہونے میں یہ تعطل اگرچہ ناگہانی اسباب سے وقوع پذیر ہوا تھا،لیکن اپنی بیماری اور ضعف کی وجہ سے یہ صورت حال غالب کے لئے مایوسی کی حد تک تکلیف دہ تھی،ادھر منشی نول کشور بھی اس تاخیر پر یقیناً گومگو کی کیفیت میں ہوں گے۔غالبؔ کے اپنے محبوب شاگرد سید غلام حسنین قدرؔ بلگرامی کو تحریر مؤرخہ ۵رمئی ۱۸۶۲ء کے خط میں کلیات کی طباعت کے سلسلہ میں ایک ایک اطلاع حاصل کرنے کی بے تابی اور تجسس سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو اس کلیات فارسی کی طباعت کی کتنی فکر لاحق تھی:

''اس رقعہ کی تحریر سے مراد ہے کہ جناب منشی صاحب سے میرا اسلام کہئے اور یہ رقعہ ان کو پڑھا کر عرض کیجئے کہ غالب پوچھتا ہے کہ فارسی کے کلیات کا چھاپا ملتوی ہے یا جاری ہے؟ ملتوی ہے تو کب کھلے گا؟ جاری ہے تو تصحیح کس طور پر ہے؟ قصیدہ اور تاریخ کلیات کا مطبع میں پتہ لگا ہے یا نہیں؟

منشی جی سے چاروں سوالوں کا جواب اور مولوی ہادی علی صاحب کا جو حال معلوم ہو وہ بھی ضرور لکھنا اور اس خط کا جواب جلد بھیجنا (۲۹)

اپنے ایک عزیز شاگرد میر مہدی مجروح کو مؤرخہ ۱۵رمئی ۱۸۶۲ء کو لکھے گئے ایک مکتوب میں کلیات کی طباعت کے التوا کی خبر ان الفاظ میں دیتے ہیں:

''کلیات کے چھاپے کی حقیقت سنو، ساٹھ صفحات چھاپے گئے تھے کہ مولوی ہادی علی مصحح بیمار ہو گئے، کاپی نگار رخصتی پر اپنے گھر گیا اب دیکھئے کب چھاپا شروع ہو۔۔۔'' (۳۰)

اپنی روز افزوں کمزوری اور بیماری نے غالب کو نہایت شکستہ خاطر اور مایوس کر دیا تھا، جس کا اظہار وہ نواب علاء الدین خان علائی کو ۱۹ جون ۱۸۶۴ء کو لکھے گئے ایک خط میں یوں کرتے ہیں:

''کلیات کے انطباع کا اختتام اپنی زیست میں مجھ کو نظر نہیں آتا'' (۳۱)

''اودھ اخبار'' کے ۱۳ مئی ۱۸۶۳ء کے شمارہ میں شائع اس اشتہار سے مایوس وناامیدی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں امید کی کرن

پھوٹی جس میں یہ مژدہ سنایا گیا:

''نواب مرزا اسداللہ خان صاحب بہادر کا فارسی کلیات مطبوع ہو کر انجام کو پہنچا، نقش ونگار اس دلآرام رنگین ادا کا اختتام کو پہونچا''(۳۲)

تمام کتاب ۔۔۴ ۳۵ جز میں چھپ کر تیار ہے اور مقام مناسب پر تصویر مصنف بھی یادگار ہے، محصول پیشگی قیمت ۔۔۴/ (تین روپے چار آنے) قرار دی تھی اور بعد ختم کتاب ۔۔(پانچ روپے) درج اخبار کی تھی، اب چونکہ رفاہ عام منظور ہوا، قیمت کا گھٹا دینا ضرور ہوا، لہذا جن سے پیشگی قیمت وصولی ہے انھیں تکلیف محصول نہ دی جائے گی، مطبع سے ٹکٹ لگا کر کتاب ارسال کی جائے گی اور جو صاحب اب طلب کریں گے ان سے للعہ/ (چار روپے) قیمت لیں گے اور متعدد جلدوں کے خریدار کی رعایت بدستور ملحوظ ہے اور ان کا حساب الگ فہرست میں محفوظ ہے''۔(۳۳)

مطبع منشی نول کشور میں ''کلیات نظم فارسی'' مطبوعہ ۱۸۶۳ء کی تفصیلات حسب ذیل ہیں:

۱۔ سائز: ۱/۲/۱۷x۲۷ اسینٹی میٹر

۲۔ کتابت کا سائز: ۲/۱/۲۰x۱۲ اسینٹی میٹر

۳۔ تعداد سطور: ۲۱

۴۔ ضخامت: ۵۶۲+۴=۵۶۶ صفحات

۵۔ قیمت: پانچ روپیہ فی جلد

۶۔ یہ کلیات غالبؔ کی تصویر اور زائچے سے بھی مزین ہے۔

۷۔ سال اشاعت ۱۸۶۳ء/۱۲۷۹ھ

کلیات نظم فارسی غالبؔ کی ترتیب حسب ذیل ہیں:

صفحہ ۱۔ :سرنامہ

صفحہ ۲۔۱۱ :فارسی دیباچہ از غالبؔ

صفحہ ۱۱۔۵۴ :چھیاسٹھ قطعات

صفحہ ۵۴۔۵۵ :ایک مخمس

صفحہ ۵۵۔۶۷ :تین ترکیب بند

صفحہ ۶۷۔۷۰ :ایک ترجیع بند
صفحہ ۷۰۔۱۶۹ :گیارہ مثنویاں
صفحہ ۱۷۰۔۳۵۲ :چونسٹھ قصائد
صفحہ ۳۵۳۔۵۳۷ :غزلیات
صفحہ ۵۳۷۔۵۵۲ :رباعیات
صفحہ ۵۵۳۔۵۵۵ :تقریظ غالبؔ (فارسی نثر میں)
صفحہ ۵۵۵۔۵۵۸ :فارسی تاریخ از میر مہدی مجروحؔ (مثنوی کے قالب میں)
صفحہ ۵۵۸۔۵۵۹ :فارسی تاریخ از اصغر علی خاں نسیمؔ (مثنوی کے قالب میں)
صفحہ ۵۵۹ :فارسی قطعہ تاریخ از محمد عبدالغنی (تلمیذ مولوی ہادی علی اشکؔ)
صفحہ ۵۵۹۔۵۶۰ :فارسی قطعہ تاریخ از شیخ امیر اللہ تسلیمؔ (مثنوی کے قالب میں)
صفحہ ۵۶۰ :دو فارسی قطعات تاریخ از منشی اشرف علی اشرفؔ
صفحہ ۵۶۰ :قطعہ تاریخ اردو از مردان علی خاں رعناؔ
صفحہ ۵۶۱۔۵۶۲ :خاتمۃ الطبع از ہادی علی اشکؔ (نثر فارسی)
صفحہ ۵۶۲ :قطعہ تاریخ فارسی از ہادی علی اشکؔ (۳۴)

کلیات نظم فارسی کی اس طباعت کے بعد اس کی متعدد ایڈیشن منظر عام پر آئے اور آخری بار یہ کلیات ۱۹۶۹ء میں امیر حسن نورانی کے اہتمام سے شائع ہوئی۔

حواشی وتعلیقات

(۱) مکتوب غالبؔ بنام میر مہدی مجروح مرقومہ ۸/اگست ۱۸۶۱ء، بہ حوالہ خطوط غالب مرتبہ مالک رام ص ۳۲۵،مکتوب ۳۷

(۲) غالب کے خطوط، مرتبہ خلیق انجم جلد ۳/ص ۱۰۵۱ مطبوعہ غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی ۱۹۸۷ء، نیز خطوط غالب مالک رام ص ۴۲۰ خط ۲

(۳) اس سے ''قیصر باغ'' مراد ہے جہاں سے پورب کی طرف جانے والی سڑک پر بائیں طرف گھومنے کے بعد جی۔پی۔او کی جانب جانے والی شاہراہ کی دائیں جانب مطبع نول کشور واقع تھا۔

(۴) ملک محمد جائسی کی شہرۂ آفاق تصنیف ''پدماوت بھاکا'' اردو رسم الخط میں مئی ۱۸۷۰ء میں حلیہ طبع سے پیراستہ ہوئی تھی۔اس میں مولوی محسن

علی ساقیؔ (تلمیذ شیخ امام بخش ناسخؔ لکھنوی) کی مثنوی کے قالب میں منظوم تقریظ چھپی تھی۔جس میں شاعر نے نول کشور پریس،اودھ اخبار مطبع کے مصححین کاتبوں دیگر کار پردازوں اور خود منشی نول کشور کی مدح سرائی کی ہے۔اس کی اہمیت وافادیت ایک طرف تو اس سبب سے ہے کہ یہ مطبع نول کشور اوراخبار اودھ کی تقریباً بارہ سالہ پیش رفت کا معاصر مآخذ ہے تو دوسری طرف قلیل مدت میں اس کی شہرت ومقبولیت کا مستند ثبوت ۔پینسٹھ(۶۵)اشعار پر مشتمل یہ مثنوی پدماوت کے صفحہ ۳۵۴ سے لے کر صفحہ ۳۵۹ تک چھ صفحات پر محیط ہے۔

(۵)اختر شاہنشاہی،مطبوعہ اختر پریس لکھنوٴ ۱۸۵۵ءص ۵۲

(۶)پروفیسر حنیف نقوی،نول کشور اور غالبؔ ص ۱۱۱، نیا دور نول کشور نمبر نومبر دسمبر ۱۹۸۰ء

(۷)خطبات گارساں دتاسی،ص ۶۵۵،انجمن ترقی اردو ہند دکن ۱۹۳۵ءص ۶۵۵

(۸)پروفیسر نورالحسن ہاشمی،منشی نول کشور کا مطبع نیا دور نول کشور نمبر نومبر دسمبر ۱۹۸۰ء

(۹)مکتوب بنام نواب علاء الدین خان علائیؔ مورخہ ۱۳ر دسمبر ۱۸۶۳ء (بحوالہ خطوط غالب،مہیش پرشاد ص ۳۵۵)اردوئے معلٰی ج اص ۴۳۳

(۱۰)منشی نول کشور اوراودھ اخبار، پروفیسر اکبر حیدری نیا دور نومبر دسمبر ۱۹۸۰ءص ۲۹۔۲۸

(۱۱)اردوی معلٰی،ص ۱۴۱،مطبع مصطفائی دہلی طبع ۱۸۹۹ء۔

(۱۲)مکتوب غالب، بنام سید بدرالدین کاشف اردوی معلٰی ج اطبع اول ص ۱۳۰، نیز خطوط غالب مہیش پرشاد،ص ص ۱۱۲۔۱۱۱''کوئی مصرع میرا اس سے خارج نہیں''معروف غالب شناس ڈاکٹر کاظم علی خان کی تحقیق کے مطابق یہاں غالب کوسہو ہوا ہے وہ لکھتے ہیں"میری تحقیق ہے کہ میر مھدی مجروحؔ کے مرتب کردہ تذکرے"طلسم راز"کے سال اتمام یعنی ۱۲۶۶ھ/۱۸۵۰ء۔۱۸۴۹ء کا غالب کا فارسی کا قطعہ تاریخ طبع ۱۸۶۳ء سے باہر رہ گیا تھا،اس کی تفصیل کیلئے دیکھئے میرا مضمون"غالب کے بعض غیر معروف ادبی آثار"مطبوعہ لکھنؤ جولائی ۱۹۸۰ء ص ص ۱۲۔۱۳

(۱۳)اس سے نیرؔ کی تعریف میں غالبؔ کا وہ قصیدہ مراد ہے جو کلیات غالب مطبع نول کشور (طبع ۱۸۶۳ء) کے قصیدہ ۱۶ میں اڑتالیس (۴۸) اشعار پر مشتمل ہے۔ص ۳۴۴ تا ۳۴۶ پر محیط اس کا مطلع یہ ہے:

چه گوہرم که محیط از صفائے گوہر من   بپائے لغز نیارد گذشتن ازسر من

(۱۴)نواب فخر الدین خاں خردؔ نواب مشرف الدین خاں کے بیٹے تھے اور غالبؔ، نیرؔ اور شیفتہؔ کے دوست تھے شاعری کے علاوہ کتابت سے شغف رکھتے تھے جو عموماً اغلاط سے پاک ہوتی تھی تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو(گلشن بے خار ص ۶۵،سخن شعراء ص ۱۴۸، بزم سخن ص ۴۴،خم خانۂ جاوید جلد ۳ ص ۱۳ مکاتیب غالب (عرشی) دیباچہ ص ۳۳۔اردوئے معلٰی جلد ا ر ص ص ۲۹۔۲۸۹

(۱۶)شہاب الدین خاں،ثاقب،نواب ضیاءالدین خان نیّراور رخشاں کے بیٹے نیز غالب کے شاگرد تھے۔

(۱۷)یوسف مرزا غالب کے شاگرد تھے ان کے تفصیلی مضمون حالات کے لئے ملاحظہ ہو، پروفیسر اکبر حیدری کا مضمون،نواب مرزا یوسف علی خاں عزیزؔ ماہنامہ ''شاعر'' بمبئی فروری ۱۹۷۲ء۔

(۱۸)اردوی معلیٰ (حصہ اول)طبع ۱۸۶۹ص ص ۲۸۹ تا ۲۹۰ (مکتوب بنام نواب ضیاءالدین خان نیّر و رخشاں)

(۱۹)ظہیر فاریابی،ظہیر الدین ابوالفضل طاہر (۱۲۰۱ء-۱۱۵۶ء)فارسی کا مشہور غزل گو شاعر جس کے بارے میں کہا گیا ہے

دیوان ظہیر فاریابی دزدید اگر بکعبہ یابی

(۲۰)محمد حسین نظیریؔ نیشاپوری (م ۱۰۲۱ھ/۱۶۱۲ء) عہد اکبر و جہانگیر کا فارسی شاعر

(۲۱)زلالیؔ خوانساری،مولانا حکیم زلالی خوانساری گیارہویں صدی ھجری کا مشہور فارسی غزل گو شاعر

(۲۲)سحبان وائل "خطیب العرب" کے لقب سے مشہور پہلی صدی ھجری کا مشہور خطیب

(۲۳)انوریؔ اوحدالدین علی بن اسحٰق ابیوردی چھٹی صدی ھجری کا مشہور فارسی قصیدہ گو شاعر

(۲۴)خاقانیؔ افضل الدین بدیل بن علی خاقانی شروانی (۵۹۵ھ-۵۲۰ھ) چھٹی صدی ھجری کا مشہور فارسی قصیدہ گو شاعر

(۲۵)غالب نامہ جلد ا شمارہ ۴-۳ ص ص ۲۵-۲۴

(۲۶)مولوی ہادی علی متخلص بہ اشک لکھنؤ سے متصل قصبہ بجنور کے شیخ حسین علی بجنوری کے بیٹے اور محمد رضا برق لکھنوی کے شاگرد تھے-اردو اور فارسی دونوں میں طبع آزمائی کرتے تھے-تاریخ گوئی میں بھی بہت مہارت تھی،مطبع نول کشور میں مصحح تھے ۱۸۶۵ء مطابق ۱۲۸۱ھ میں انتقال ہوا

(۲۷)خطوط غالب (حصہ اول)مرتبہ مالک رام ص ۲۶۷

(۲۸)اردوی معلیٰ (حصہ اول)ص ۱۶۴

(۲۹)اردوی معلیٰ (حصہ اول)ص ص ۴۱۱ تا ۴۱۲،نیز خطوط غالب مرتبہ مالک رام ص ۳۸۷

(۳۰)اودھ اخبار لکھنؤ کا اشتہار مؤرخہ ۱۳/مئی ۱۸۶۳ء(بحوالہ تحقیقی نوادر از پروفیسر اکبر حیدری ص ص ۶۵۔۳۶۴

(۳۱) ایضاً ص ۳۶۶

(۳۲)کلیات غالب مطبع منشی نول کشور ۱۸۶۳ء/۱۲۷۹ھ ص ص ۵۶۲۔۵۶۰

☆☆☆

پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید
پروفیسر، شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

تذکرۃ الکرام: مشائخ سلسلۂ قادریہ وارثیہ مجیبیہ کا مہم ومعتبر مرقعہ

فارسی ادب میں صوفیا کے تذکروں کی تدوین کا سلسلہ پانچویں صدی ہجری کے وسط سے نظر آتا ہے جب شبہ قارۂ ہند میں ’’کشف المحجوب‘‘ کی تصنیف ہوئی۔اس کے مصنف علی بن عثمان الجلابی الہجویری معروف بہ داتا گنج بخش ہیں جنہوں نے ۴۵۰ھ میں تصوف کے موضوع پر یہ کتاب لکھی۔اصلاً کشف المحجوب تصوف کے عمیق اور باریک موضوعات پر لکھی گئی ہے لیکن اس میں جابجا صوفیاے کرام کے تذکرے آئے ہیں اس بناء پر اسے تدوین تذکرۂ صوفیا میں اساسی حیثیت دی جاسکتی ہے۔حضرت گنج بخشؒ نے یہ کتاب لاہور میں لکھی اور یہ ہندوستان میں معرض وجود میں آنے والی اولین منثور فارسی تصنیف بھی ہے۔کشف المحجوب کے بعد جسے اصالتاً تذکرۂ صوفیا کی حیثیت نہیں حاصل ہے، دوسری کتاب اس موضوع پر ’’ترجمۂ طبقات الصوفیہ‘‘ ہے جسے شیخ الاسلام ابواسمعیل عبداللہ انصاری نے ۴۸۱ھ میں اپنی مجالس وعظ میں املا کرایا تھا اور جس میں ایک سوبیس صوفیا کا تذکرہ ہے۔

کشف المحجوب اور ترجمۂ طبقات الصوفیہ کے بعد شیخ فریدالدین عطار کی ’’تذکرۃ الاولیاء‘‘ ملتی ہے جسے کاملاً واصالتاً تذکرہ قرار دیا جاسکتا ہے۔تذکرۃ الاولیا کے بعد اس موضوع پر تحفۃ المرشدین من حکایات الصالحین، ترجمہ خلاصۃ المفاخر، مناقب العارفین، خلاصۃ المناقب، ثواقب المناقب اولیاء اللہ، صفوۃ الصفا، نفحات الانس من حضرات القدس، مجالس العشاق، رشحات عین الحیات، تذکرہ اولیا وسلسلۂ العارفین، ریاض الاولیا، سراج السالکین ولطایف العارفین، ثمرات المشایخ، مجمع المحققین، ریاض الواصلین، ریاض العارفین، انیس الطالبین، شمائل اتقیا، تذکرۃ السالکین اور اسرار الابرار فی اخبار الاخیار وغیرہ تذکرے معرض وجود میں آئے۔

ہندوستان میں بھی صوفیا کے تذکروں کی تدوین کی روش نے خوب خوب رواج پایا، اور اس شبہ قارہ میں بہت مشہور ومعروف تذکرے معرض وجود میں آئے۔ چنانچہ میر خورد سید محمد مبارک علویؒ کی سیر الاولیاء فی محبت الحق جل وعلیٰ ملا جمالی کنبوہ معروف بہ درویش جمالی کی سیر العارفین، شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ کی اخبار الاخیار فی اسرار الابرار، محمد دارا شکوہ قادری کی سفینۃ الاولیا اور سکینۃ الاولیا کے علاوہ مونس الارواح، حضرات القدس، مخبر الواصلین، معارج الولایت، ریاض الاولیا، مطلوب الطالبین، روضۂ اقطاب، تذکرۂ قادریہ، انفاس العارفین اور روضۃ الاولیا وغیرہ وہ مشہور ومعروف تذکرے ہیں جو مورد بحث تذکرہ تذکرۃ الکرام کی تالیف سے قبل تصنیف ہوئے۔

صاحب تذکرۃ الکرام کے عہد یعنی تیرہویں صدی ہجری مطابق انیسویں صدی عیسوی میں بھی تدوین تذکرۂ صوفیا کی روش بدستور قایم رہی اوراس صدی میں بھی تذکرۂ صوفیا کی ایک معتد بہ تعداد مخطوطات ومطبوعات کی شکل میں نظرآتی ہے،جن میں معیار سالکین طریقت، بحر ذخار، بشارت مظہریہ درفضایل حضرات طریقۂ مجددیہ،اصول المقصود،فوایدسعدیہ، بیاض دلگشا،خزینۃ الاصفیا،انوارالعارفین،الروض الازھر فی مآثر القلندر،اورانتصاح من ذکراہل الصلاح وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

صاحب تذکرۃ الکرام مولانا شاہ ابوالحیوۃ قادری قدس سرہ کی ولادت صاحب اعیان وطن مولانا حکیم سید شاہ محمد شعیب نیرؔ کے مطابق یکم ذیقعدہ ۱۱۹۵ھ کو پھلواری شریف میں ہوئی۔ صاحب اعیان کی اس اطلاع اور خود مصنف کتاب کی تذکرۃ الکرام میں بہم پہنچائی گئی اطلاع کے اعتبار سے مصنف کے سن ولادت میں قدرے اختلاف نظر آتا ہے جو قابل اعتناء نہیں ہے۔صاحب تذکرۃ الکرام جب حضرت تاج العارفینؒ کے ذکر کے ضمن میں موے مبارک زاداللہ شرفھما کی تشریف آوری کا ذکر کرتے ہیں تو وہاں لکھتے ہیں کہ یہ ۱۲۴۷ھ ہے اوراللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے یہ دولت بے بہا حضرت تاج العارفینؒ کے خانوادے میں باقی ہے۔پھر متصلاً اعجاز آثار شریف کے ذکر کے ضمن میں اپنی عمر ترپن سال بیان کرتے ہیں۔چنانچہ رقمطراز ہیں:

> ’’...... و تا حال کہ سال یکہزار و دو صد و چہل و ھفت از سال هجرت است بعنایت الله و فضله در فرزندان آنحضرت رضی الله عنه این دولت و کرامت باقیست ...... و درمدت پنجاه و سه سال که عمر این کمینۂ بارگاه غوثیه رسیده گاهی چنین دیده و نشنیده ......‘‘

(تذکرۃ الکرام؛ص۱۶۹)

اس کے علاوہ حضرت شیخ العالمینؒ کے ذکر کے ضمن میں صاحب کتاب نے اپنا ایک واقعہ مرقوم کیا ہے جس میں بھی اپنی عمر ترپن سال بتائی ہے۔چونکہ ۱۲۴۷ھ میں حضرت شیخ العالمینؒ کا وصال ہوا اور مذکورہ بالا بیان بھی ۱۲۴۷ھ کا ہی ہے، اس لیے یہ محقق ہے کہ مصنف نے یہ واقعہ بھی ۱۲۴۷ھ میں ہی ذکر کیا ہے۔چنانچہ صاحب تذکرۃ الکرام راقم ہیں:

> ’’...... باز از ان سال تا این زمان که عمر به پنجاه و سه سال رسیده گاهی زخم پشت پانشده و نشان جراحات سابقه هنوز باقیست۔‘‘

(تذکرۃ الکرام؛ص ۱۰۴)

مذکورہ بالا دونوں اقتباسات کی روشنی میں یہ بات متیقن ہوجاتی ہے کہ جب ۱۲۴۷ھ میں مصنف کی عمر تریپن سال تھی تو یقیناً ان کی ولادت ۱۱۹۴ھ میں ہوئی ہوگی لیکن صاحب اعیان کی اطلاع زیادہ مستند ہے کیونکہ انہوں صاحب تذکرۃ الکرام کے والد ماجد کی بیاض میں مندرج یہ تاریخ لی ہے جسے داخلی شواہد کی بنیاد پر متعینہ قیاسی تاریخ پر بہر حال استناد حاصل ہے۔

مولانا شاہ ابوالحیوۃ قدس سرہ حضرت شیخ العالمینؒ کے چوتھے صاحبزادہ ہیں۔آپ نسباً ہاشمی ہیں اور حضرت جعفر طیارؓ کی اولاد سے تھے۔مولانا شاہ ابوالحیوۃ قادریؒ نے بالاستیعاب تمام درسیات کی تکمیل مولانا شاہ احمدی قدس سرہ سے کر کے تمام علوم مروجہ میں دسترس کامل حاصل کر لی۔مولانا شاہ ابوالحیوۃ قادریؒ اپنے عہد کے عالم نبیل و فاضل جلیل تھے اور اکثر و بیشتر اوقات مطالعہ کتب اور تصنیف و تالیف و درس و تدریس میں بسر ہوتے۔آپ کے تلامذہ میں جن لوگوں کے نام صاحب اعیان کو دستیاب ہوسکے وہ انہوں نے اپنی کتاب کے حاشیہ پر درج کیے ہیں اور آپ کے ان تلامذہ میں اکثر علم و فضل میں اساتید کے منصب پر فائز ہوئے۔اس کے علاوہ مولانا شاہ ابوالحیوۃ کے علم و فضل سے متاثر ہوکر بتیا کے مہاراجہ نے اپنے اتالیق کے حیثیت سے ان کو اپنے یہاں مامور کیا۔کچھ دنوں تک تو آپ نے اس کی خواہش کے مطابق اس کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ دی لیکن مشاغل سلوک اور تصنیف و تالیف کے ذوق و شوق نیز حضوری شیخ سے غیبت کے احساس نے حضرت مولانا ابوالحیوۃ قدس سرہ کو مجبور کیا کہ اس ذمہ داری سے سبکدوشی حاصل کر لیں چنانچہ آپ نے ۱۲۳۸ھ میں اس خدمت کو ترک کر دیا اور پھلواری شریف واپس آکر مسند درس آراستہ فرمائی۔

صاحب اعیان کی اطلاع کے مطابق مولانا ابوالحیوۃ قادریؒ نے مختلف آثار علمی اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔لیکن اب تک راقم کو تذکرۃ الکرام کے علاوہ کوئی دوسری تصنیف نہ مل سکی۔تذکرۃ الکرام میں مصنف نے متعدد جگہوں پر یہ ذکر کیا ہے کہ میں نے حضرت شیخ العالمینؒ کے ان اصحاب کا بھی تذکرہ مرتب کیا ہے جو اس وقت عالم حیات میں ہیں لیکن چونکہ ان نفوس قدسی کو اپنے اسرار کی پردہ دری گوارہ نہیں ہے اس لیے اس تذکرہ کو میں نے مخفی رکھ چھوڑا ہے اور وہ اصحاب کہ جو عالم جاودانی کی طرف کوچ کر چکے ہیں ان کا ذکر اس تذکرہ میں شامل کر رہا ہوں۔چنانچہ راقم ہیں:

> "چون تصرفات و اخلاق آنحضرت بقدر ضرورت
> در تحریر در آمد، خواستم کہ مجمل احوال فرزندان آنحضرت کہ
> نونہالان بستان ولایت اند و سرو گلستان ہدایت معہ احوال یاران
> طریقہ بقید قلم آریم و تکملۂ کتاب بآن سازیم۔ لیکن بنظر آنکہ

بیشتر یاران صاحب تصرف و فرزندان باکرامت که ارکان دین اند، ذکر احوال آنها بجز افشای رازنیست و متقرر و متحقق صوفیه صافیه رضی الله عنهم است که افشای سر این طائفه خالی از قباحتی نیست۔ یامتصرف را از تصرف باز میدارد یا نقصان عمروی میکند یا مظهر و مذکر را در مهلکه این طائفه می اندازد، خصوصاً ازین بزرگان که تذکره شان منظور دارم، اکثر اند که نوشتن تصرفات آنها سراسر موجب ملال خاطر شریف آنها ست و سبب اعراض ازین گنهگار۔ بنا بر ذکر آن ستوده خصالان که بر سجادۂ هدایت جلوه افروز اند رساله علیحده کردم و مخفی که تابقای ماو ایشان افشای سر براغیار نگردد و آنانکه ازین جهان نقل کردند بی تامل احوال آن سالکان طریقت درین کتاب درج کنم ......"

(تذکرۃ الکرام؛ص۹۰-۵۸۹)

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرۃ الکرام کے علاوہ مصنف نے اپنے معاصر صوفیاے طریقت کے احوال پر مشتمل ایک اور تذکرہ مرتب کیا تھا۔لیکن افسوس کہ دست بردِ زمانہ سے وہ تذکرہ محفوظ نہ رہا اور اب دستیاب نہیں ہے البتہ مولانا حکیم محمد شعیبؒ کے پاس اس نسخۂ تذکرہ کے کچھ ناتمام کرم خوردہ اوراق جو خود مصنف کے ہاتھ کے تحریر کردہ تھے موجود تھے جیسا کہ انہوں نے اپنی اعیان وطن میں تحریر کیا ہے۔

صاحب تذکرۃ الکرام کو غالباً شعر گوئی و سخن سنجی کا بھی مذاق تھا اور عجزؔ تخلص کرتے تھے۔لیکن ان کے اشعار کے نمونے دستیاب نہیں ہو سکے ہیں۔امکان ہے کہ یہ مذاق شعر گوئی محض تفنن طبع کے طور پر ہوگا اور کبھی کچھ کہہ لیتے ہوں گے جسے باضابطہ طور پر مدون نہ کیا ہو یا اگر کیا ہوگا تو گردش زمانہ سے ضایع ہو گیا ہو،جیسا کہ ان کے مصنفہ دوسرے تذکرۂ صوفیا کے ساتھ ہوا اور یہی دوسرا قیاس قرین صحت جان پڑتا ہے کیونکہ اس زمانے میں خود مصنف کے خانوادے میں شعر گوئی کا اعلیٰ ذوق تھا اور کثرت سے صاحب دیوان شعراے متصوفہ ہمیں نظر آتے ہیں۔بہر کیف مولانا ابوالحیوۃ قادریؒ کی شہرت کا سبب ان کی منثور تصنیف تذکرۃ الکرام ہی ہے۔

صوفیاے کرام کا یہ تذکرہ مولانا شاہ محمد ابوالحیوۃ قادریؒ نے ۱۲۴۹ھ میں تصنیف کیا۔اس کتاب میں کل پچاس صوفیا اور تین خاتون صوفیا کا تذکرہ ہے جو علم وفضل، ورع وزہد اور تقویٰ و پرہیزگاری میں نابغۂ عصر تھے۔مصنف نے اس کتاب کی تمہید میں لکھا ہے کہ ایک زمانے سے

میرے دل میں یہ خیال تھا کہ میں اپنے شیوخ کرام کے احوال کو جمع کروں جو دنیا و آخرت میں میرے لیے سرمایۂ افتخار و یادگار رہو، لیکن ایام کی نا مساعدت کی بنیاد پر اپنے اس خیال کو عملی جامہ نہیں پہنا پا رہا تھا کہ یکا یک اللہ تعالیٰ کی توفیق رفیق ہوئی اور میں نے اس کام پر کمر ہمت کس لی۔ چنانچہ راقم ہیں:

"...... میگوید بندۂ بی بضاعت احقر الناس الراجی الی النجات محمدابو الحیات قادری فلواروی البهاری وطناً جعفری الزینبی نسباً غفرالله ذنوبه و ستر عیوبه که از مدتی بجمع احوال بعضی شیوخ کرام خود علی نبینا و علیهم السلام در دل تمنا داشتم که تایا دگاری درد نیا و سرمایۂ در عقبیٰ باشد۔ اما از نامساعدت ایام فرصت دست نمیداد و از بی بضاعتی جرأت برین مقصد اعلیٰ نمی افتاد که یك ناگاه الهام لاریبی رهبری نمود و تائید غیبی مددگاری فرمود و کمرهمت بحصول این معنی چست بربستم...... "

(تذکرۃ الکرام؛ص۴-۳)

تذکرۃ الکرام میں مصنف نے جتنے واقعات بیان کیے ہیں ان میں سے بیشتر کا مشاہدہ یا تو مصنف نے بذات خود کیا ہے یا پھر ثقہ شاہدین سے براہ راست سنا ہے۔شواہد اور خود مصنف کے زھد و ورع اور تقویٰ و پرہیز گاری کی بنیاد پر ان اطلاعات و واقعات کی صداقت و صحت اور استناد میں کسی قسم کا سقم نظر نہیں آتا۔ترقیم واقعات میں صاحب کتاب نے اتنی دیانت داری کا اظہار کیا ہے کہ اگر کسی واقعہ کے ثقہ راوی کا پتہ نہیں چل سکا ہے یا کسی مورد ذکر شخصیت کے احوال بہ استناد حاصل نہیں ہو سکے ہیں تو اس کی وضاحت کر دی ہے۔

تذکرۃ الکرام حضرت اقدس مولانا سید محمد وارث رسولنما بنارسیؒ کے ذکر سے شروع ہوتا ہے جو صاحب کتاب کے جد مکرم حضرت اقدس تاج العارفینؒ کے استاد اور مرشد تھے۔ان سے متعلق واقعات مصنف کو یا تو خود اپنے والد اور شیخ حضرت شیخ العالمین سے معلوم ہوئے، یا اپنے استاد سے یا پھر اس خانوادہ کے اوراد و ملفوظات کے مجموعہ مسمی بہ "فضل النبی" سے۔خود راقم نے بھی "فضل النبی" سے فروغ بصارت و بصیرت پائی ہے اور صاحب تذکرۃ الکرام نے حضرت تاج العارفین کی جن ترقیمات کا حوالہ دیا ہے ان میں سے کئی یادداشتوں کو خود اپنی نظروں سے دیکھا ہے۔حضرت شیخ العالمینؒ کے عہد کے بیشتر واقعات خود مصنف کے مشاہدے میں آئے ہیں۔البتہ پھلواری شریف کے بزرگان سالفہ کے جو احوال صاحب تذکرۃ الکرام نے رقم کیے ہیں وہ سمعی ہیں، لیکن ان کے راوی ثقہ اور مستند ہیں۔چنانچہ مصنف نے اپنے تذکرے کے استناد و صحت کے ضمن میں رقم کیا ہے:

"...... برخی از احوال ارکان دین که از ثقات بسمع رسیده معه اسانید بقید قلم آوردم و آنچه خود معاینه کردم درآن حاجت ارقام اسانید ندیدم باآنکه اکثر ثقات هم در آن معاینه شریك مابودند ترك نام آنها کردم...... "

(تذکرۃ الکرام؛ص۴)

جیسا کہ عرض کیا گیا یہ کتاب پچاس صوفیا عظام اور تین صالحات ومحصنات کے ذکر پر محتوی ہے۔صاحب کتاب نے سب سے پہلے حضرت اقدس مولانا سید محمد وارث رسولنما بنارسیؒ کا ذکر کیا ہے اور اپنے اس تذکرہ کو حضرت اقدس خواجہ عماد الدین قلندرؒ کے احوال پر ختم کیا ہے۔ بدایت ونہایت کی یہ ترتیب منتخب کرنے کا سبب صاحب تذکرۃ الکرام مولانا ابوالحیوۃ قادری نے یہ بیان کیا ہے کہ حضرت مولانا رسولنماؒ چونکہ حضرت تاج العارفینؒ کے پیر طریقت ہیں اور حضرت خواجہ عماد الدینؒ ان کے پیر بیعت ہیں اس لیے میں نے اپنی اس کتاب کی ابتداء حضرت تاج العارفین کے پیر طریقت کے ذکر سے کی اور انتہا ان کے پیر بیعت کے احوال پر تا کہ شروع سے آخر تک ایک ارتباط رہے۔چنانچہ لکھتے ہیں:

"...... وابتدای کتاب تیمناً وتبرکاً از احوال پیر طریقت حضرت تاج العارفین مخدوم شاه محمد مجیب الله القادری رضی الله تعالیٰ عنه کردم و انتهای بر احوال پیر بیعت آنحضرت رضی الله تعالیٰ عنه تابدایت و نهایت را با خود هانوعی ازربط باشد و نام این کتاب تذکرة الکرام نهادم ۔ **واللّٰه المستعان ومنه التوفیق۔**"

(تذکرۃ الکرام؛ص۴)

کتاب کے اختتام پر بھی اس بات کا اعادہ کرتے ہوئے مصنف نے رقم کیا ہے:

"...... وبدایت ذکر از احوال حضرت مولانا رسولنما که مرشد وپیر طریقت حضرت تاج العارفین رضی الله عنهما بودند ، کردم و نهایت بر ذکر احوال حضرت خواجه

محبوب رب العالمینؒ که پیر بیعت تاج العارفینؒ بودند ، نمودم...... ''

(تذکرۃ الکرام؛ص ۲۶۵)

اس تذکرہ میں مذکور بیشتر صوفیاے کرام اور مشائخین عظام سلسلہ قادریہ سے تعلق رکھتے ہیں لیکن جابجا جن دوسرے سلاسل کے بزرگان کے تذکرے ضمناً یا اصلاً آئے ہیں ان میں چشتیہ،نقشبندیہ،سہروردیہ،فردوسیہ،ابوالعلائیہ،شطاریہ اور قلندریہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اس تصنیف سے مصنف کا مقصد اصلی خود اپنے شیخ ومرشد حضرت شیخ العالمینؒ کے احوال وافکار کو محفوظ کرنا تھا۔اپنے اس مقصد اصلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صاحب تذکرۃ الکرام نے واضح لفظوں میں لکھا ہے کہ اس تالیف سے میرا اصل مقصد حضرت شیخ العالمین مخدوم شاہ نعمت اللہ قادریؒ کا احوال رقم کرنا ہے جو باغ ولایت کے گل خنداں اور چمن ہدایت کی بہار ہیں،جن کے عارض سے چمنستان طریقت کو طراوت وتازگی نصیب ہوئی اور جادۂ طریقت کے سالکین کو بے مثال رہبری ورہنمائی میسر آئی۔چنانچہ تحریر کرتے ہیں:

'' ...... مقصود اصلی ماازین تالیف بیان احوال خیرمآل حضرت ایشان (حضرت مخدوم شاه نعمت الله قادریؒ) است، نه تبیان حال مطلق درویشان، غزل سرائی مابراین گل خندان ولایت است و نواسنجی ما بر این بهار چمنستان هدایت که گل رویش گلستان طریقت را تازه بهاری بخشید و رنگ و بویش بستان حقیقت را طرفه تر رونقی و تراوتی داد- نسیم عنبر شمیم الطاف وافضالش غنچۂ دل گرفته طالبان را در شگفتآورد و نکهت روح افزای کمالش مشام جان گل چینان مقصود را معطر ساخت...... ''

(تذکرۃ الکرام؛ص ۱۸-۳۱۷)

تذکرۃ الکرام میں مولانا شاہ ابوالحیوۃ قادریؒ نے حضرت تاج العارفین اور حضرت شیخ العالمین رضی اللہ عنہما کے احوال کے ضمن میں بہت سے اسرار تصوف بیان کیے ہیں، جو حضرت شیخ العالمین نے اپنی مجالس میں بیان فرمائے تھے اور مصنف بھی چونکہ ان مجالس میں بذات خود موجود تھے اس لیے انہوں نے براہ راست سنے۔ان مکنونات ورموز تصوف پر گفتگو مشائخین مصنف کے افکار متصوفہ کی صراحت ووضاحت میں قدرے مفید ہوگی،اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض پر کچھ روشنی ڈالی جائے۔

ریاضت ومجاہدہ تصوف میں اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔چنانچہ ابوعلی دقاقؒ کا قول ہے کہ جو شخص مجاہدے سے اپنے ظاہر کو آراستہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ مشاہدے سے اس کے باطن کی تزئین فرما دیتا ہے۔ریاضت ومجاہدہ کا مقصد اصلی نفس سرکش کو مطیع وفرمانبردار بنانا ہے۔چنانچہ

صاحب تذکرۃ الکرام نے حضرت مولانا رسولنماؒ کے احوال کے بیان میں حضرت تاج العارفینؒ کے حوالہ سے ریاضت وسلوک کے فوایدتحریر کرتے ہوئے حضرت خواجہ عماد الدین قلندرؒ کے خیالات کی وضاحت یوں کی ہے کہ اگر چہ اخگر عشق ہوا ہوس کے سارے خس و خاشاک کو خاکستر کرڈالتی ہے لیکن جب تجلّی کا انقباض ہوجاتا ہے اور آتش عشق کی شوریدگی میں عمر کے ساتھ کمی آتی ہے تو پھر نفس سرکش سرابھارنے لگتا ہے ،لیکن جب ریاضت ومجاہدہ کے ذریعہ تزکیۂ نفس کیا گیا ہو تو سرکشی نفس ظہور پذیر نہیں ہوتی اور عشق کے قبض وسکون کے باوجود کوئی خلل نہیں پڑتا۔ ریاضت کے فوائد کے سلسلہ میں حضرت شیخ العالمینؒ کا خیال ہے کہ اس سے صفائے قلب حاصل ہوتا ہے جس کے نتیجے میں قلب نیکی و خیر کا مسکن بن جاتا ہے اور فلاح وصلاح کے مسکون ہونے کے باعث بالآخر سالک کا قلب عطیات ایزدی کا مخزن ہو جاتا ہے، جو اس کی ملکیت ہوتی ہے اور سالک کے لیے ایک لمحہ کے لیے بھی ریاضت ومجاہدہ سے دور ہونا آفت ومصیبت ہے۔ حضرت شیخ العالمینؒ اپنے مریدین کو تقید سلوک اور ریاضت ومجاہدہ کی تشویق دلاتے ہوئے فرماتے تھے کہ حالات وکیفیات تو اولیاء اللہ کی نگاہوں کی برکت سے جانوروں اور شجر وحجر میں بھی پیدا ہوتی ہیں اور ان کا اثر ظاہر ہوتا ہے جیسا کہ نجم الدین کبریٰؒ کے کتے ،سید اشرف جہانگیرؒ کی بلی اور میر ابوالعلیٰؒ کے سرمست ہاتھی کے واقعات مشہور ہیں اور راجگیر کی پہاڑیوں میں واقع حضرت مخدوم بہاریؒ کی چلہ گاہ سے ہویدا ہیں۔ اس کے باوجود صرف کیفیات و حالات کی بنیاد پر ان حیوانات واشجار واحجار کو عارف نہیں کہا جاسکتا کیونکہ لذت عرفان انسانیت سے وابستہ ہے اور انسانیت ریاضت ومجاہدہ اور کسب سلوک سے حاصل ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اپنے نفس پر ظلم کرنے سے عبارت ہے۔

حضرت شیخ العالمینؒ مریدین ومتوسلین کو امور شرعی کے علاوہ کسی کام میں بطریق وجوب حکم نہیں دیتے تھے اور جو بھی حکم ہوتا وہ بطریق اباحت ہوتا تھا، کیونکہ بمنزلہ وجوب حکم کے اصدار کے بعد حکم عدولی کی صورت میں مرید کے خسارے کا امکان ہے اور وہ مسلک طریقت کا گنہگار ہوگا۔ آپ اپنے مریدین کو نوافل کی تحریص بھی نہ فرماتے بلکہ صرف ترغیب فرماتے تھے۔ حضرت شیخ العالمینؒ کے سلوک میں سے ایک یہ بھی تھا کہ آپ لباس درویشی کی تعظیم وتکریم فرماتے اگر چہ صاحب لباس باطناً اس تعظیم وتکریم کا مستحق نہ ہوتا، اور لباس درویشی کی تعظیم کو واجبات طریقت سے شمار فرماتے تھے کیوں کہ دراصل یہ صاحبان فقر کا لباس ہے اور لباس کی تعظیم صاحب لباس کی تعظیم کے مرادف ہے۔ اپنے مریدین کو ترک وتجرید کا حکم نہ دیتے جب تک کہ اس کے احوال اس کے متقاضی نہ ہوں۔

ستر احوال اور امور باطن ومقامات عالیہ کے پوشیدہ رکھنے کا اہتمام ان مشائخین کے یہاں بہت زیادہ تھا ،جس کا اندازہ حضرت تاج العارفین اور حضرت شیخ العالمین رضی اللہ عنہما کے بعض احوال کے مطالعہ سے بخوبی ہوگا۔ خوارق اور تصرف باطنی کا عمداً اظہار بھی ان صوفیا کی نگاہ میں فعل قبیح اور مذموم تھا اور اظہار تصرف کو تقرب الی اللہ میں رخنہ تصور فرماتے تھے۔ اسی طرح مکشوفات کا بے باکانہ اظہار بھی ان اصحاب کے یہاں مطعون وملعون تھا۔ حضرت شیخ العالمینؒ نے صاحبان کشف کی جو اقسام بیان فرمائی ہیں ان میں اہل اسرار خفی وجلی کے مکشوفات کو

کذب و دروغ سے منزہ اور مکر نفس وفریب شیطان سے مبرا بیان فرمایا ہے اور ان کے اقوال کو مرتبہ وحی وصدق سے مماثل گردانا ہے اور ایسے صاحبان اسرار کے وجود کو کبریت احمر بتایا ہے۔اس قسم کے علاوہ بقیہ صاحبان مکاشفہ کی قسموں پر اعتماد و یقین نہ کرنے کا حکم دیا ہے کیونکہ ایسے مکاشفات نفس و شیطان کے مکر وفریب سے مامون نہیں ہوتے۔ساتھ ہی حضرت شیخ العالمینؒ کا یہ بھی خیال ہے کہ سالک کو بھی کشف کا خیال نہیں آنا چاہیے کیونکہ محض خیال ہی طالب کو قرب مطلوب سے دور کر دیتا ہے۔کشف ارواح بھی حضرت شیخ العالمینؒ کی نگاہ میں ایک حد کے بعد ناپسندیدہ تھا اور اسے بھی دنیاداری تصور فرماتے تھے کیونکہ اس میں بھی اشغال اور اوراد و وظائف سے کسب کیا جاتا ہے۔فی الحقیقت اس عمل کو فقر و درویشی سے جدا تصور فرماتے اور کہتے تھے کہ کہ جادوگر بھی اعمال سفلی سے ایسی قوت سافلہ حاصل کر لیتے ہیں۔

حضرت شیخ العالمینؒ کی نگاہ میں تقویٰ و پرہیز گاری کی پاسداری اور حفظ کا اہتمام لازمی تھا اور فرماتے تھے کہ شریعت مطہرہ میں ہر چیز کی قضا ہے لیکن تقویٰ و پرہیز گاری کی قضا نہیں اگر کسی کام میں ترک ہو گیا تو ضایع ہو گیا۔گویا کہ خرقۂ تقویٰ پیوند قبول کرنے والا نہیں ہے، اس لیے سالک کو چاہیے کہ ہر لحہ اس کے حفظ کی بابت ہوشیار رہے کہ کسی کام میں ساقط نہ ہو جائے۔اسی بنیاد پر اپنے کسی ذاتی مفاد کے پیش نظر خواہ وہ دینی ہو یا دنیوی حضرت شیخ العالمینؒ کی نگاہ میں کلام الٰہی کے اجزاء کا ورد بھی'' ولا تشتر وابایاتی ثمناً قلیلا '' کی رو سے جائز نہ تھا اور فرماتے تھے کہ مسلک تصوف میں دین و دنیا کی کسی ضرورت کے لیے بھی آیات قرآنی پڑھنا بیع وشراء کے مماثل ہے کیونکہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے کلام کے بمقابلہ ہماری ساری ضرورتیں ثمن قلیل ہیں، البتہ رضاے الٰہی کی طلب کی نیت سے ان آیات کا ورد کرنا چاہیے اور یقین ہے کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ وہ حوائج دینی و دنیوی بھی انعام مزید کی صورت میں پوری فرمادے گا۔

ان رموز و اسرار تصوف کے علاوہ تذکرۃ الکرام میں توبہ و استقامت توبہ، ورع و زھد و تقویٰ، استغراق و استغناء، سکوت و خاموشی، خوف ورجا، خشوع و تواضع، قناعت و توکل، شکر و یقین، صبر و رضا، ذکر و عبودیت، خلق و جود و سخا، توحید و معرفت اور سماع و عشق و محبت وغیرہ جیسے نکات تصوف پر بھی جا بجا لطیف خیالات و افکار کا ترشح نظر آتا ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ان صوفیاے کرام کے ہر ہر واقعات میں سالک طریقت کے لیے مشعل موفقیت و کامیابی فروزاں ہے تو نامناسب نہ ہوگا۔تذکرۃ الکرام میں بعض منقولات و مشمولات ایسے بھی مل سکتے ہیں جو عقل فلک پیما کی غنچہ پیشانی کا باعث ہوں لیکن حقیقتاً وہ عشق بلاخیز کے انشراح کا سبب بھی ہیں۔

تذکرۃ الکرام کی زبان نہایت سادہ و سلیس اور رواں ہے۔صاحب کتاب نے اصل واقعات کی ترقیم میں اپنا زور قلم نہیں دکھایا ہے۔ البتہ تمہید کتاب اور بعض واقعات کی ابتداء میں کہیں کہیں مصنف کے اشہب قلم کی جولانی کے نمونے نظر آتے ہیں۔کتاب کی ابتداء حمد الٰہی سے کرنے کے بعد نعت نبی اور مناقب اصحاب و اہل بیت بیان کرتے ہیں پھر سبب تالیف کا بالاختصار ذکر کرنے کے بعد موضوع اصلی کی طرف آجاتے ہیں۔تذکرۃ الکرام میں تطویل لاطایل سے کاملاً اجتناب کیا گیا ہے۔ضروری و لازمی صنعتوں مثلاً جناس، سجعات، کنایہ و استعارہ اور

ایہام وغیرہ کے علاوہ نہ صناعت ادبی کی حشر سامانیاں ہیں اور نہ ہی اثقال واشکال کی تگ وتاز۔

نہایت سادہ و دلنشین اور عام فہم انداز میں واقعات واحوال اس طرح بیان کر دیے ہیں کہ جن کی افہام وتفہیم ہر طبقہ و زمرۂ افراد کے لیے سہل ہے۔ بیان کی شستگی وعذوبت، مبیَّن کا تقدس وتنزہ اور مبیِّن کی ارادت وعقیدت مل کر ایسا سماں پیدا کرتی ہیں کہ اگر اس میں قاری کی للہیّت کی آمیزش بھی ہو جائے تو وہ خود اپنے تصور میں ان واقعات کو ظہور پذیر ہوتے ہوئے دیکھتا ہے یا پھر ان اصفیا سے استفاضہ کا احساس کرتا ہے۔مصنف نے عربی عبارت، امثال وحکم، قرانی آیات اور احادیث نبوی ﷺ کا بقدر ضرورت استعمال کیا ہے اور جملوں میں اس طرح پیوست کر دیا ہے کہ کہیں کہیں قاری انتقال لسانی کو محسوس بھی نہیں کر پاتا۔مولانا شاہ ابوالحیوۃ قادری نے تلفیق نثر بنظم سے بھی ماہرانہ انداز میں کام لیا ہے اور بیشتر مقامات پر ایسے برمحل اور موزوں عربی و فارسی اشعار پیوست کیے ہیں کہ مصنف کے حسن انتخاب کی داد دینی پڑتی ہے۔ صاحب کتاب نے جن شعراء کے اشعار سے تلفیق کی ہے ان میں سعدیؔ، خسروؔ، رومیؔ، حافظؔ اور جامیؔ وفغانیؔ کے علاوہ خود مصنف کے خانوادہ کے بعض صاحبان سخن بھی شامل ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹرمبشرہ صدف

اسسٹنٹ پروفیسر وصدرشعبہ فارسی،ایم ڈی ڈی ایم کالج،بی آر اے بہار یونیورسٹی،مظفر پور، بہار

خوشیوں کا باغ : علامتی بیانیہ اوراستعاراتی فضا کا تنقیدی مطالعہ

انور سجاد کا شمار اردو کے ان ممتاز ناول نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اردو ناول کو محض بیانیہ اظہار کی سطح سے اٹھا کر علامتی اور استعاراتی جہات سے آشنا کیا۔ان کے ناول خوشیوں کا باغ میں یہ تبدیلی نہایت وضاحت سے سامنے آتی ہے، جہاں انہوں نے قدیم روایتی ڈھانچوں سے ہٹ کر ایک نئے بیانیے کی تشکیل کی کوشش کی۔انور سجاد کے یہاں مکالمہ کردار کے نفسیاتی انکشاف سے زیادہ واقعات کی تہہ در تہہ تشکیل کا ذریعہ بن جاتا ہے،اور یہی وجہ ہے کہ خوشیوں کا باغ کو تجزیاتی ناول قرار دیا جاتا ہے۔ یہ ناول اپنی ساخت میں ہائرونیمس بوش کی تصویری علامتوں کا مرہونِ منت ہے، جو اپنی پینٹنگز میں انسانی کمزوریوں، اخلاقی انحطاط اور وجودی کجیوں کو نہایت دل آویز اور ہول ناک طریقے سے پیش کرتا ہے۔

بوش نے دنیا کو تین بنیادی حصوں میں تقسیم کیا: "حوا کی تخلیق"، "خوشیوں کا باغ"،اور "موسیقی کا جہنم"۔انور سجاد کا ناول دراصل بوش کے گارڈن آف ارتھلی ڈیلائٹس اور میوزیکل ہیل کی علامتی توسیع ہے،جس میں انسانی دنیا پر برپا ہونے والے قہر،ظلمت اور اخلاقی انحراف کے اثرات کو نئی تہذیبی فضا میں برتا گیا ہے۔ یوں بوش کی تصویری علامت اور انور سجاد کے بیانیے میں ایک ہی فکری اور جمالیاتی فلسفہ فعال نظر آتا ہے۔

اردو ادب میں جدیدیت کا باقاعدہ ظہور 1960 کی دہائی میں ہوا جب ترقی پسند تحریک کی حقیقت نگاری کے مقابل لکھنے والوں نے نفسیاتی پیچیدگی، علامتی اظہار اور تجریدی اسلوب کی طرف رخ کیا۔مغربی جدیدیت خصوصاً جیمز جوئیس اور ورجینیا وولف کے اثرات نے اس رجحان کو گہرائی بخشی، جس کا عکس صنعتی معاشرت، عالمی جنگوں اور وجودی بحرانوں کے تناظر میں ملتا ہے۔اردو میں جدید افسانے اور ناول کے اس ارتقائی سفر میں انور سجاد کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ان کا ناول خوشیوں کا باغ اسی جدید حسیت کا روشن نمونہ ہے، جو بوش کی پینٹنگ سے علامتی سطح پر نہ صرف ہم آہنگ ہوتا ہے بلکہ اسے برصغیر کے سیاسی وتہذیبی بحران کے پس منظر میں نئے معانی بھی عطا کرتا ہے۔ یوں یہ ناول اردو ناول کی تاریخ میں محض ایک اضافی تجربہ نہیں بلکہ ایک سنگ میل ہے، جس میں علامت گری کے ساتھ ساتھ پوسٹ ماڈرن تکنیکیں بھی جا بجا موجود ہیں۔

خوشیوں کا باغ اگرچہ 1981ء میں شائع ہوا،مگر اس کی معنوی پرتیں پاکستان کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی انہدام سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ ناول پلاٹ اور کردار کے اعتبار سے روایتی ڈھانچے کو مکمل ترک نہیں کرتا،مگر اسے ایک تجرباتی پیرائے میں برتتا ہے۔ کردار اور واقعات واضح صورت میں سامنے نہیں آتے؛ان کی پیش کش میں ایک ابہام،تہہ داری اور داخلی اضطراب کی کیفیت نمایاں ہے۔موضوعاتی طور پر یہ ناول تہذیبی زوال،سماجی قدروں کی شکست و ریخت اور سیاسی جبر کی علامتی تصویر پیش کرتا ہے۔مرکزی کردار "میں" ایسے معاشرے کا نمائندہ ہے جہاں اقدار فرسودہ ہو چکی ہیں، جبر اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے اور فرد احتجاج کی سکت کھو چکا ہے۔یہی کیفیت اسے شدید داخلی خلفشار میں مبتلا کرتی ہے۔

مارشل لا اور مذہبی قوانین کے نفاذ نے عام شہریوں کے بنیادی حقوق کو معطل کر دیا تھا۔قانون، جو انسانی جان و مال کے تحفظ کے لیے وجود رکھتا ہے، آہستہ آہستہ افراد کی آزادی کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال ہونے لگا۔انور سجاد اسی صورتحال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔:

جو طاقت انسانی حقوق، جمہوریت اور اپنے خدا کی حفاظت کے نام پر دنیا کو فنا و برباد کرنے پر تلی ہے،اس طاقت نے لفظوں ہی کو خصی کر دیا ہے کہ جو ہمارے اضطراب،تشویش اور پیرو میتھی، بےبسی کو سمیٹ کر استادہ نہیں ہوتے۔فلسفہ،ٹیکنالوجی کا حاشیہ بردار بن کر رہ گیا ہے اور ٹیکنالوجی کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔(از خوشیوں کا باغ) خوشیوں کا باغ کا کردار "میں" ایک ایسے غیر انسانی اور غیر جمہوری نظام میں سانس لیتا ہے جس کی گرفت اُس کی روح تک کو مجروح کر دیتی ہے۔اسی کردار کے ذریعے انور سجاد نے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور اقتصادی انتشار کی وہ پرتیں کھولی ہیں جو پاکستانی معاشرے پر اوندھے ہوئے نظام کی طرح مسلط دکھائی دیتی ہیں۔وہ ماحول جس میں "میں" بسر کرتا ہے، سامراجی مفادات،فوجی قوت اور مذہبی جبر کے ایسے چکر میں محصور ہے جس کی فضا خوف، لالچ اور بے یقینی سے آلودہ ہے۔شاید اسی لیے حرص و ہوس اور برائی کے غلبے میں گھرا ہوا یہ معاشرہ ایک ایسے کردار کو جنم دیتا ہے جو مادی آسائشوں کے باوجود ذہنی ابتری اور روحانی اضطراب کا اسیر ہے۔وہ سکون کا طلبگار ہے—ایسا سکون جو نہ صرف ظاہری نظم کا ضامن ہو بلکہ باطنی آسودگی کا در بھی کھولے۔

یہ ناول پاکستان کی اُس سیاسی فضا کی ترجمانی کرتا ہے جس میں امن و اطمینان کی جگہ جبر و استبداد نے لے لی تھی۔"میں" اپنے بنیادی حقوق کی پامالی کا ذمہ دار سیاسی قوتوں اور اقتدار کے اُن مراکز کو ٹھہراتا ہے جنہوں نے جمہوریت کے تصور کو کبھی حقیقت میں ڈھلنے نہ دیا۔ فوجی حکومتوں اور غیر جمہوری نظاموں نے اس خواب کو نہ صرف مسخ کیا بلکہ اسے بے رحمی سے کچل ڈالا۔اس سارے عمل کا سب سے بڑا بار اُن حساس شہریوں پر پڑا جو محکومی کی زنجیروں میں مزید جکڑ دیے گئے۔عوامی حقوق سلب کرنے کے لیے ہر حربہ آزمودہ گیا، یہاں تک کہ اُن کے بنیادی انسانی حقوق تک چھین لیے گئے۔

ناول کے بیانیے میں واقعات کا تسلسل شعوری طور پر منقطع ہے۔قصہ ایک منظّم، خطی ڈھانچہ اختیار نہیں کرتا اور یہی بے ربطی ناول کے فنی تجربے کا مرکزی جوہر ہے۔ابتدا ہی سے ایک غیر روایتی آہنگ قائم ہوتا ہے جو آخری سطر تک برقرار رہتا ہے۔ربط کے بجائے شعور کے ٹکڑوں اور تجربے کی شکست وریخت کو جگہ دی گئی ہے، کیونکہ انور سجاد اس سیاسی و مذہبی جبر کو مصور کرنا چاہتے ہیں جو شرعی قوانین کے نام پر شہری زندگی کو انتشار اور خوف میں دھکیل رہا تھا۔

"میں" جب اپنے تجربات کو بیان کرتا ہے تو وہ اسی انتشار کے زیرِ اثر بیانیہ تشکیل دیتا ہے؛ چنانچہ تسلسل کا نہ ہونا محض فنی تجربہ نہیں بلکہ اُس ذہنی کیفیت کا عکس ہے جس میں یہ کردار قید ہے۔سجاد نے روایتی طریقِ بیان کو یکسر ترک کر کے جدید اسلوب اختیار کیا اور یہی ان کے فن کو روایتی ناول نگاری سے ممتاز کرتا ہے۔

کردار نگاری کے اعتبار سے بظاہر یہ ناول غیر معمولی حد تک غیر روایتی ہے، مگر حقیقت میں اس کا ہر نقش "میں" کے گرد مرکوز ہے۔یہ کردار نام و مقام کے تعین سے آزاد ہے، مگر اسی بے نامی میں اس کی علامتی قوت پوشیدہ ہے۔"میں" کے ذریعے ملک گیر ناانصافی، ظلم، جبر، غیر انسانی قانون اور حقوق کی پامالی کو نہایت شدت سے پیش کیا گیا ہے۔اس کردار میں انور سجاد کی اپنی داخلی بے چینی، فکری انتشار اور سماجی اضطراب کی جھلک بھی محسوس ہوتی ہے۔

اس علامتی کائنات میں دیگر کردار مرکزی شعور کو گہرائی اور وسعت دیتے ہیں۔محبوبہ ایک بنیادی جذباتی حوالہ ہے، مگر فنی اعتبار سے بیوی اور ماں کے کردار زیادہ مؤثر علامتی قدریں رکھتے ہیں۔بیوی 'منتظمہ' اور قربانی کی علامت ہے جو کردار کی اذیتی جدوجہد میں ڈھارس کا کام دیتی ہے۔ماں صوفیانہ سکون اور ماورائی تحفظ کا استعارہ ہے، جو آیت الکرسی کے ذریعے کردار کو داخلی خوف سے بچاتی ہے؛ یہ کردار مذہب کے روحانی اور غیر سیاسی پہلو کی علامت بھی ہے۔

ایم ڈی ڈول کا تاج والا ایک سفاک آمرانہ اقتدار کا نمائندہ کردار ہے۔زرہ بکتر والے حکمران طبقے اور ملا-ملٹری اتحاد کی علامتی تجسیم ہیں، جو ہر لمحہ کردار کو گھیرنے اور اس کی آزادی سلب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ہجوم ان گنت صفروں سے عبارت ہے، جو اجتماعی انقلاب اور عوامی بے چینی کا اشاریہ ہے۔شاہ منصور، جو رقصِ تعلیم کی رمز لیے ہوئے ہے، حرّیت، روحانی بغاوت اور تخلیقی آزادی کا استعارہ ہے۔اس کی صدائیں شخصیت کے لاشعور کو بیدار کر کے اسے جبر کے خلاف مزاحمت کی طرف مائل کرتی ہیں۔

یوں ہر کردار مرکزی "صفر" کی معنویت کو مکمل کرتا ہے اور پورا ناول ایک علامتی و نفسیاتی کائنات میں ڈھل جاتا ہے، جہاں فرد کا داخلی بحران پوری سماجی ساخت کی شکستگی سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

یہ ناول تکنیک کے اعتبار سے اردو میں ایک منفرد اور ممتاز مقام رکھتا ہے۔پورا بیانیہ واحد متکلم کے صیغے میں تشکیل پایا ہے، اور کہانی

سنانے والا خود ناول کا مرکزی کردار ہے۔زبان و بیان کے حوالے سے دیکھا جائے تو شدت سے محسوس ہوتا ہے کہ اس ناول کی نثر اپنے آہنگ، ساخت اور تصویریت میں شاعری اور مصوری سے غیر معمولی طور پر قریب ہے۔انور سجاد نے جس سطح پر علامتی اور استعاراتی زبان کو برتا ہے، اس نے ایک طرف متن کو عام فہم ہونے سے دور کر کے اسے تہہ دار اور تہہ نشین بنا دیا ہے اور دوسری طرف اردو ناول کو اسلوبی تجربوں کی نئی دنیا سے روشناس کرایا اور اس کے بیانیے کو وسعت عطا کی۔

اس کیبیانیے کی بنیاد جدیدیت کی دو بنیادی تکنیکوں شعور کی رو اورفراگمنٹیشن) بیانیے کا انقطاع وانتشار(پر قائم ہے۔شعور کی رو، جو بنیادی طور پر جیمز جوئس کے ہاں اپنی کلاسیکی صورت میں ملتی ہے، یہاں کردار کے اندرونی خلفشار، بے سمتی اور شعوری وتحت الشعوری تجربات کے غیر منظّم بہاؤ کی صورت میں جلوہ گر ہے۔مثال کے طور پر یہ اقتباس:

میں باہر برآمدے کے ستون کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو جاتا ہوں اور لاوے کے بہتے سمندر کو دکھتا ہوں۔

یک لخت مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں بالکل صفر ہوں۔میں برآمدے کی سیڑھیاں اتر کے سڑک پر آجاتا ہوں میرے ذہن میں اور کچھ نہیں سوائے ایک صفر کے جو میرے دماغ کے گرد محیط ہے۔

میں صفر ہوں- پاس سے کوئی تیزی سے گزرتا مجھے دھکا دیتا ہے۔

میں بمشکل قدم جما پاتا ہوں۔صفر۔

میں تمہیں اپنا ضمیر دیتا ہوں اور دل کی دھڑکن بھی۔

صفر-اس دھکے سے اُدھر

میں تمھیں اپنے تیز دو دھاری لفظ دیتا ہوں۔

اُس دھکے سے ادھر-صفر

مجھے باندھ دو اپنے بازوؤں کے حلقے سے روشن دن کے ساتھ

صفر-میرے ہاتھ میں بلیک وارنٹ ہے۔میں اسے فضا میں لہراتا ہوں۔

مجھے باندھ دو، اپنی آنکھوں کی سرخی سے زمین کی ناف کے ساتھ۔

وہ سانس کہ جس کے ساتھ ہجوم کے پسینے کی خوشبو اور نعرے میرے پھیپھڑوں میں داخل ہوئے تھے، پوری قوت سے باہر نکالتا ہوں سمندر پر فضا میں جامد سمندر کو لوٹتے سمندری پرندے کے حلق میں جمی چیخ پگھل جاتی ہے۔چیخ۔میرے حلق کی پوری قوت۔میں پہلا سانس لیتا ہوں۔

اب مجھے پتا نہیں، میں ہجوم کے کس حصے میں ہوں، نہ مجھے اس کی پرواہ ہے۔ میں اب صفر نہیں۔تنہا۔بے کار۔مہمل۔

بلکہ ان گنت صفروں میں ہوں جو اکٹھے ہو کر اپنے میں سے کسی کو اکائی چن لیتے ہیں تو حساب کی نئی منطق جنم لیتی ہے۔

میں اس مٹی کے سوا کچھ نہیں جو میرے پیروں کے نیچے ہے۔(خوشیوں کا باغ،صفحہ 120)

یہ وہ مقام ہے جہاں خواب، یادیں، دھڑکتے خوف، اور بوش کی تصویریں ایک ہی سیال بہاؤ میں گھل مل جاتی ہیں، اور قاری کو کردار کے ذہنی ونفسیاتی گہراؤ میں کھینچ لیتی ہیں۔اسی کے ساتھ فراگمنٹیشن یعنی بیانیے کا شعوری طور پر ٹکڑوں میں بکھرا ہونا، بوش کی پینٹنگ کی تین پینلوں کی طرح ناول کے مختلف حصوں میں صورت پذیر ہے۔تعارفی ابواب، خوابوں کے مناظر، سماجی انتشار اور داخلی مکالمات سب ایک دوسرے سے مربوط ہونے کے باوجود نامکمل اور منتشر دکھائی دیتے ہیں۔ یہ انتشار محض تکنیکی استعمال نہیں بلکہ عین اس سماجی وفکری شکست و ریخت کا تخلیقی اظہار ہے جو ناول کے سیاسی پس منظر میں جگہ جگہ منکشف ہوتی ہے۔جیسا کہ ایک مقام پر مرکزی کردار کہتا ہے:

رات بے خوابی کی وجہ سے میں صبح اپنے دفتر دیر سے پہنچتا ہوں مجھے پتا چلتا ہے کہ ایم۔ڈی نے مجھے بلایا ہے۔میرا اسسٹنٹ کسی کام سے کہیں گیا ہے۔اسے اپنی سیٹ پر نہ پا کر میرا دل اندیشیوں سے دھڑکنے لگتا ہے۔ایم ڈی نے مجھے یوں بے وقت یاد نہیں کیا۔اور پھر کئی ہفتوں سے ایم۔ڈی اور چیرمین مجھے اشاروں کنایوں میں سمجھانے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ میرا رویہ دن بدن غیر معمولی ہوتا جا رہا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کیوں میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔میری بیوی کو بھی اس قسم کا شبہ ہوا تھا لیکن اسے میں نے قائل کر لیا تھا۔معلوم ہوتا ہے کہ میرے مالک قایل نہیں ہوئے،کیا ہندسوں پر میری گرفت واقعی نہیں رہی؟

کیا ہندسے واقعی اب میری گرفت سے آزاد ہو کر اپنی رضا سے اپنی جگہ بیٹھتے ہیں؟ کیلکولیٹر پر جواب میری فرم کی منشا کے خلاف آتا ہے؟ میں کسی صورت بھی فرم کے ساتھ غداری نہیں کر سکتا۔ میں تو پیشہ ورانہ اخلاقیات کا سختی سے پابند ہوں، پھر بھی یہ ہندسے راز فاش کرنے پر تلے ہیں؟ باغی ہندسے۔ یہاں سچ بولنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ جو میں خانہ پری کرتا ہوں،صرف وہی سچ ہے۔نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ میں اپنی فرم کے لیے ناگزیر ہوں۔ میں محفوظ ہوں۔ پھر بھی میرا دل؟ ہوسکتا ہے میری یہ کیفیت عارضی ہو۔ بلکہ ہے۔میرا ڈاکٹر کہتا ہے ۔میں دفتر والوں سے نظریں بچا کر اعصابی سکون کی گولی نگل لیتا ہوں۔ میں ایم ڈی کے بند دروازے کی طرف دیکھتا ہوں۔ جانے ایم ڈی کے دفتر کے بند سفید دروازے پر مجھے ڈول کے تاج والا نظر کیوں آتا ہے جو تین ٹانگوں والی کرسی پر اطمینان سے بیٹھا اپنی کھلی چونچ میں پھنسی کالی کھردری، گدرائی گدرائی برہنہ عورت کو جو گھنٹی سے لٹکتی اور سر کے بل کھڑی کھلی ٹانگوں والی برہنہ عورت کی کاربن کاپی ہے اسے اک ہاتھ سے ران سے پکڑ یرفتہ رفتہ نگلتا ہے کہ اسکی ترتیب دی ہوئی موسیقی کے عفریتی کنڈکٹر سے لے کر پائپ والے خرگوش تک اور خودوں میں چہرہ چھپائے زرہ بکتروں والوں سے لے کر چادر لپیٹے سرائے کی سیڑھیاں چڑھتے،مقعد میں ٹھکے قلم کے پروالے تک سب الیکٹرانک ساؤنڈ سسٹم

سے ابلتی موسیقی کے سروں سے ہم آہنگ ہیں اور جو ہم نہیں ہیں وہ منکر موسیقی کے اس جہنم میں تڑپتے موت کی خواہش کرنے پر مجبور ہیں۔ڈول کے تاج والا مطمئن ہے کہ تصویر کے باہر کہیں مغرب سے آتی روشنی کی لال سفید لکیریں اور نیلے آسمان ٹمٹماتے ستارے اس کی راہ کو تعین کرتے ہیں کہ جس پر چل کر اس نے اس شخص کو تصویر کے وسط میں قید کر دیا ہے جس سے اب تصویر کا وسط مشرق بن گیا ہے ۔(خوشیوں کا باغ)

یہ بیانیہ نہ خطی ہے اور نہ روایتی؛ بلکہ اپنی ساخت میں ایک ایسی زمانی بے ترتیبی اور کثیر سطحی حقیقتوں پر مشتمل ہے جہاں خواب، حقیقت اور تنقیدی تاثرات اس طرح باہم گتھم گتھا ہو جاتے ہیں کہ قاری کو ایک شکستہ سماج کی دھڑکنیں اپنے اصل ٹھہراؤ کے بغیر تیزی سے دھڑکتی محسوس ہوتی ہیں۔یہ انتشار محض اسلوبی چال نہیں بلکہ وجودی بے چینی، پیشہ ورانہ عدم تحفظ، کارپوریٹ نگرانی اور شخصیت کی اندرونی شکستگی کا گہرا اظہار ہے، جو پورے متن میں ایک دبے ہوئے زلزلے کی مانند موجزن رہتا ہے۔اسی تناظر میں بوش کی پینٹنگ کے جہنمی حصے سے مماثلتیں اور بھی واضح ہو جاتی ہیں۔عورتوں کے عریاں اور مضطرب اجسام، مخلوقات کا عفریتی تماشا، موسیقی کے آلات کی علامتی ہلاکت، اور مرکزی کردار کا ایک غیبی گرفت میں مقید ہو جانا یہ سب ایک ایسی داخلی جہنم کی تشکیل کرتے ہیں جو نہ صرف کردار کے لاشعور کا عکاس ہے بلکہ بیرونی دنیا کے وحشیانہ، غیر انسانی اور طاقت پرست ڈھانچے کا بھی تصویری استعارہ بن جاتا ہے۔

مذکورہ اسلوب کی ایک خوبصورت مثال درج ذیل اقتباس ہے:

شہر سپاٹ ہے بے روح بے رنگ۔اپنے بطن میں حرامیوں کو لیے پیٹ کے بل خود کو گھسیٹتا ہے۔اس میں یہ خواہش مر گئی ہے کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر اپنی دودھاری چیخ سے آسمان کو چیر دے۔گھروں کی پشتیں ڈوبتے دن کی لپٹوں سے خوف زدہ ہیں۔ان کی بنیادوں میں رینگتی تاریکیاں چھوٹے حوصلوں کی رمق؛ اور یہ شہر رینگتا ہے، ہر روز اپنی دہلیزوں کو چاٹتا خود کو گھسیٹتا ہے، شاندار مکانوں کے اندر اکھڑے پلستروں والی غلام گردشیں، کھڑکیوں، دروازوں پر بے حیا پردے، سڑکوں پر ٹوٹے جوتوں، ننگے پیروں سے چپک جانے والا پگھلتا کولتار، بھیانفرتیں گھٹیا محبتیں، گھٹیا شریں جو گالیوں کے گڑھوں، نالیوں، گھوروں میں گندھ جاتی ہیں جہاں کوڑے کرکٹ گندگی کی تلچھٹ کے ساتھ ایک چہرہ بھی گٹر میں پھسل جاتا ہے۔

نہیں۔یہ میں نہیں۔میں اسے نہیں جانتا۔(خوشیوں کا باغ)

ناول کی علامتی و استعاراتی جہت کو مزید واضح کرنے کے لیے چند اقتباسات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔سماجی جہنم اور استحصال کے عفریت کو بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

وہ کہتے ہیں اگر تم شریف صالح ہو جاؤ گے تو تم امیر ہو جاؤ گے... آپ کو قربان کر کے آپ کی کھالیں تک بیچ دی جاتی ہیں۔

یہ مذہبی پروپیگنڈا کے سہارے ہونے والے استحصال کی بے رحمی کو بے نقاب کرتا ہے۔

اسی طرح امید اور نجات کی جستجو کو یہاں انقلابی پیکر دیا گیا ہے:

نیا آدم نئی زمین۔نئے سمندر... سورج جسے ابھی اس تصویر کے وسط سے طلوع ہونا ہے۔

نفسیاتی قید و بند اور لایعنیت کے تجربے کو کرداریوں بیان کرتا ہے:

میں لاتعداد رسیوں سے بندھا ہوں جن کے سرے دور دھند میں جا کر غایب ہو جاتے ہیں... تنی رسّیاں چاروں اور مجھے کھینچتی ہیں۔

اور پھر وہ پراسرار صوفیانہ وجد جو ظلمت کے دل میں روشنی کا راستہ بناتا ہے:

من بردارمی رقصم من بردارمی رقصم ، بردارمی رقصم ، می رقصم ، رقصم ، رقصم ، رقصم ۔۔۔۔...

یہ تمام اقتباسات ناول کی شعری فضا، علامتی ساخت اور اس کی جمالیاتی شدّت کو نہ صرف نمایاں کرتے ہیں بلکہ انور سجاد کی تخلیقی بصیرت کی تہ داری اور اس کے فکری و اسلوبی آہنگ کو بھی پوری قوت کے ساتھ اجاگر کرتے ہیں ناول 1979ء میں اُس وقت لکھا گیا جب جنرل ضیاء الحق نے 1977ء کے مارشل لاء کے ذریعے ذوالفقار علی بھٹو کو معزول کر کے پاکستان پر سخت گیر آمرانہ نظام مسلط کیا۔ ضیائی دور (1977-1988) پاکستان کی سیاسی و سماجی تاریخ کا ایک نہایت تاریک اور گھٹن زدہ باب ہے۔"اسلامائزیشن" کا نعرہ دراصل ایک سیاسی پروپیگنڈا تھا جس کے ذریعے حدود آرڈیننس، شرعی عدالتوں اور یک رخے مذہبی نصاب نے سماج پر ایسا جبر مسلط کیا جس سے فکری و سماجی آزادی تقریباً ناپید ہوگئی۔ یہ "ملا-ملٹری اتحاد" کی وہ شکل تھی جس کے سائے میں اختلاف رائے جرم بن گیا اور شہری آزادیاں مسلسل سلب ہوئیں۔اسی پس منظر میں انور سجاد کا ناول ایک احتجاجی آواز بن کر ابھرتا ہے:

"عظیم مقدر کی زنجیریں توڑتا ہے"

یہ سطر ضیائی شریعت کے بظاہر مقدس مگر حقیقتاً جابرانہ ڈھانچے کے خلاف ایک علامتی چوٹ ہے۔ناول میں "امام مہدی" اور "مسیح موعود" کے حوالے بھی اسی گھٹن زدہ دور میں عوام کی اس نفسیاتی پناہ گاہ کی طرف اشارہ ہیں جہاں مظلوم انسان نجات دہندہ کے انتظار میں امید کا دیا روشن رکھتا ہے۔

چنانچہ خوشیوں کا باغ میں انور سجاد نے ایک عام شہری کی آواز میں پورے ملک کے مسائل، فکری جمود اور سماجی کساد بازاری کو جس دقتِ نظر اور علامتی قوت کے ساتھ پیش کیا ہے، وہ اسے اردو ناول کے ممتاز ترین متون میں شامل کرتا ہے۔انہوں نے روایتی خطی بیانیہ ترک کر کے علامتی و استعاراتی اسلوب اختیار کیا، جو جدیدیت کے شعورِ کائنات ہی کا حصہ ہے۔ یہ ناول شخصی بے بسی سے اجتماعی اضطراب تک ایک پورا سفر طے کرتا ہے اور بیانیے میں شعور کی روانی (Stream of Consciousness) اور "تجزیہ در تجزیہ" کے ٹکڑوں (fragmentation) کے ذریعے ایک ایسی تصویر بناتا ہے جو بیک وقت مصوری، شاعری اور داستان کا امتزاج محسوس ہوتی ہے۔

علامتی کردار، تہذیبی حوالے اور بوش کی پینٹنگوں سے اٹھائے گئے رنگ، سب مل کر اس ناول کو "پینٹنگ نما" بیانیہ بنا دیتے ہیں، جہاں "سورج کا طلوع" محض روشنی نہیں بلکہ یاَس اور جبر کے خلاف ایک نفی ہے—مزاحمت کا ابتدائی نقطہ۔

آج کے دور میں بھی جب پاکستان مذہبی انتہا پسندی، شناختی انتشار اور معاشی بحرانوں سے دوچار ہے، یہ ناول یاد دلاتا ہے کہ جہنم کو بدلنے کا واحد راستہ "رقصِ آزادی—" یعنی شعوری بغاوت، فکری جرات اور انفرادی روشنی کا سفر ہی ہے۔

انور سجاد کی یہ تخلیق اردو ناول کو نئی فکری جہت عطا کرتی ہے اور قاری کو محض دیکھنے پر نہیں بلکہ محسوس کرنے، سوچنے اور بالآخر متاثر ہونے پر مجبور کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خوشیوں کا باغ کا شمار بجا طور پر اردو کے اہم ترین ناولوں میں کیا جاتا ہے۔

☆☆☆

محمد عاصم
خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف، بہار

مکتوبات حضرت شاہ مجا قلندر: تعارف وافادیت

سید العرفا شاہ مجتبیٰ عرف شاہ مجا قلندر گیارہویں صدی ہجری کے کبار مشائخ صوفیہ میں شمار کئے جاتے ہیں، جن کی ذات گرامی سے ایک خلقت مستفید و مستفیض ہوئی اور جن کے خلفا و مجازین کی ایک بڑی تعداد صوفیائے سالکین کی نمائندہ بنی، آج بھی جن سے علوم و معارف اسلامی کی اشاعت کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔

۱۰۲۱ھ میں آپ کی ولادت ہوئی، ۱۸۔ برس تک اپنے خال محترم حضرت شیخ ابوسعید بن قاضی عبداللطیف کے زیر سایۂ عاطفت رہے اور دینی علوم کی تحصیل کی، اس کے بعد پھر لکھنؤ میں شیخ عبدالقادر فاروقی کی صحبت میں رہ کر کتب درسیہ تمام پڑھیں اور درسیات سے فارغ ہوئے۔

تعلیم کے زمانے سے ہی عشق الٰہی کا غلبہ ہونے لگا تھا، آپ کے ذکر میں یہ بات نقل کی گئی ہے کہ جس زمانہ میں آپ ''ہدایہ'' پڑھا کرتے تھے ایک روز اثنائے مطالعہ یہ آواز سنی کہ'' مجا کتاب را بینداز وخدا را بشناس ''مگر آپ مطالعۂ کتاب میں مشغول رہے یہاں تک کہ جب تیسری مرتبہ آپ نے یہی آواز سنی تو اس آواز سے ایسا متاثر ہوئے کہ استغراقی کیفیت میں استاد کے روکنے کے باوجود مدرسہ سے نکل گئے اور حضرت میر لاہوری کے مرید ہونے کے قصد سے رخت سفر باندھا؛ مگر تحصیل علم کے اس زمانہ میں حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ سے مشرف ہوئے اور آپ کے حکم جون پور کے شہرۂ آفاق بزرگ شیخ عبدالقدوس جونپوری کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے، اور ان کی تعلیم وتربیت سے ''سید العرفا'' کے مقام پر فائز ہوئے اور اس درجہ کمال حاصل کیا کہ اپنے شیخ کی پیرانہ سالی کی بنیاد پر ان کے حکم سے اپنے پیر بھائیوں کی تربیت وتعلیم فرمایا کرتے تھے۔

شیخ عبدالقدوس قدس سرہ کی تعلیم وتربیت کا اثر ان پر ایسا ہوا تھا کہ دنیا ومافیہا کی طلب سے بیزار دل ہو گئے تھے اور ان کی مکمل زندگی ''اللہ بس باقی ہوس'' سے عبارت نظر آتی تھی؛ چنانچہ جب حضرت عبدالقدوس قدس سرہ کی خانقاہ سے رخصت ہونے لگے، تو شیخ نے فرمایا کہ مجھے کیمیا کا نسخہ معلوم ہے اطمینان قلب کے لئے سیکھ لو، ضرورت پر کام دے گا، آپ نے عرض کیا کہ جو حقیقی کیمیا تھی، وہ تو آپ نے سکھا دی اب اور کسی کیمیا کی ضرورت نہیں ہے، یہ سن کر شیخ عبدالقدوس بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ مجا! میاں تم تو مجھ سے بھی بڑھ گئے، میں نے تو سیکھا؛ مگر کبھی بنایا نہیں، تم تو سیکھنا بھی نہیں چاہتے۔

حضرت مجا قلندر جب پیر کے آستانہ سے رخصت ہونے لگے تو آپ کے پیر نے اپنی آستین جھاڑ دی، یہ اشارہ تھا کہ تم میرے

آخری خلیفہ ہو۔ پیر سے رخصت لے کرلا ہر پور میں مقیم ہوئے اور وہیں رہ کر رشد و ہدایت سے خلق آلہی کو مستفید فرمایا۔

آپ کی وفات ۱۵، ربیع الثانی ۱۰۸۴ھ کو لاہر پور میں ہوئی اور وہیں سپر خاک ہوئے۔

آپ کے خلفا و مریدین میں بڑے بڑے اہل کمال گذرے ہیں، ان میں چالیس خلفا صاحب ارشاد اور صاحب سلسلہ تھے جن کے واسطے سے ہزاروں فقرا اور مریدین ہوئے، ان میں سب سے مقدم شیخ عبدالرسول راجگیر ی کچھندوی کی شخصیت تھی جن کے متعلق حضرت مجا فرمایا کرتے تھے کہ''مجا عبدالرسول و عبدالرسول مجا''۔ان کی فضیلت وکاملیت کی سند یہ ہے کہ حضرت مجا قلندر قدس سرہ نے خود خدمت امامت وارشاد و ہدایت آپ کے سپرد فرمائی اور اپنی صاحب زادی عصمت مآب اور برادر شاہ یسین قلندر کو آپ سے مرید کرایا، ان کے علاوہ متعدد خلفا اصحاب کمال گذرے ہیں۔ اہل پھلواری کے سرخیل طریقت سیدنا تاج العارفین مخدوم شاہ پیر محمد مجیب اللہ قادری قدس سرہ کے پیر بیعت کا سلسلہ شیخ عبدالرسول کے واسطہ سے حضرت مجا قلندر سے منسلک ہے۔

حضرت مجتبی شاہ مجا قلندر ایک اہل معرفت صاحب تصانیف بزرگ تھے، آپ کی متعدد کتابیں تالیفات ہیں، ان میں ''مناقب الخلفا'' خاندانی بزرگوں کے حالات میں، اذکار واشغال پر انیس العاشقین اور حجۃ العارفین علاوہ آپ کے مکتوبات خاص اہمیت کے حامل ہیں، حسب موضوع ذیل کی سطور میں مجموعۂ مکتوبات شاہ مجا کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

مکتوبات: حضرت مجا قلندر کا مجموعۂ مکاتیب حقائق و معارف کا منبع اور سالکین طریقت کے لئے ایک عمومی دستور کی حیثیت رکھتا ہے، جن پر عمل پیرا ہوئے بغیر منازل سلوک طے کرنا بے سود ہے۔ آپ کے مکتوبات کے قلمی نسخے مختلف خانقاہی کتب خانوں میں موجود ہیں، جیسے خانقاہ مجیبیہ اور خانقاہ کاظمیہ کاکوری میں قلمی نسخے دستیاب ہیں، مکتوبات کا ایک نامکمل نسخہ مطبع مجتبی لکھنو سے 1312ھ میں شائع ہو چکا ہے، خانقاہ خانقاہ مجیبیہ کیاہنامہ مجلّہ المجیب میں مکتوبات شاہ مجا قلندر کے اردو تراجم حضرت مولانا حکیم سید محمد یوسف رضوی پھلواروی کے قلم سے متن کے ساتھ سابق میں شائع ہو چکے ہیں، حضرت مجا کے مکتوبات کا مجموعہ کل 46 مکاتیب پر مشتمل ہے۔ مجموعہ مکتوبات کو حضرت شاہ تراب علی قلندر بن شیخ محمد کاظم قلندر کاکوروی نے تلاش وتفحص کر کے ۱۲۲۴ھ میں مدون کیا۔ دیباچۂ کتاب میں مذکور ہے:

"پوشیدہ مباد که که این مکاتیب قطب الاقطاب ... حضرت شاہ مجتبی عرف شاہ مجا قلندر لاھرپوری است .... کہ بہ بعضی یاران و خلفای خود نگارش فرمودہ بودند ... تراب علی ولد حضرت شاہ محمد کاظم قلندر ... آن را بتلاش بہ ھم رسانیدہ بہ ترتیب مرقوم گردانیدہ ..." (مجموعۂ مکتوبات ص:۲)

یہ عالمانہ وعارفانہ مکاتیب جن نامور مریدان وخلفاء ومجازین کے نام لکھے گئے ہیں، ان میں شیخ یاسین برادر خورد شیخ مجا، خلیفۂ اجل شیخ عبدالرسول راجگیری، شیخ ابونجیب عثمانی ساکن امیٹھی، شیخ فتح قلندر جونپوری، شیخ مظفر ابدھی، شیخ عبداللطیف اکبرآبادی، مولانا خوش نویس، میر حسین ساکن بہرائچ، خواجہ محمد حسین، شاہ طالب اللہ، شیخ جلال جونپوری وغیرہ کے ناموں کی تصریح مجموعۂ مکتوبات میں ملتی ہے، بعض خطوط مطلق ہیں، ناموں کی تصریح نہیں کی گئی ہے۔ اس مجموعہ مکتوبات میں 13 مکتوبات شیخ عبدالرسول کے نام مذکور ہیں ۷ مکتوبات شیخ فتح

قلندر، ٦، مکتوبات شیخ ابونجیب عثمانی اور ایک ایک مکتوب باقی مخاطبان مذکور کے نام نوشتہ ہیں۔

حضرت مجا قلندر کے مکاتیب ان کے معاصر مشائخ کے صوفیانہ مکتوبات میں اختصاصی اہمیت وافادیت کے حامل نظر آتے ہیں، ان میں پہلی چیز یہ کہ آپ کے مکتوبات سلسلہ قادریہ قلندریہ کی خاص تعلیمات کے ساتھ عمومی تعلیمات پر بھی مشتمل ہیں، طریقت شریعت کی باتیں سلک تحریر میں پیروئی گئی ہیں، طریقت کی تعلیم جہاں اہل طریقت کے استفادے کی چیز ہے، وہیں شریعت کے اسرار ونکات پر مشتمل اہم چیزیں عوام کے لیے مفید ہیں۔ آپ کے مکتوبات کی افادیت متعدد پہلوؤں سے مسلم ہے، اگر حضرت شاہ مجا قلندر کے معاصر مشائخ کے مکتوبات میں آپ کے رفیق حضرت شاہ پیر محمد لکھنوی کے مکتوبات سے ان کے مکتوبات کا موازنہ کیا جائے تو دونوں شیوخ کے مکاتیب اہل خواص کے حوالے سے ایک مسلسل تعلیمات کا سلسلہ معلوم ہوتے ہیں، حضرت شاہ پیر محمد کے مکتوبات ارشاد سلوک میں تجرید اور توکل ویقین کی تعلیم پر مشتمل ہے وہیں حضرت شاہ مجا قلندر کے مکتوبات میں مکاشفہ کی حصول کی تعلیم پر زور دیا گیا ہے، حضرت مجاہ کے نزدیک توحید حقیقی تک رسائی کے لئے مکاشفہ پر دسترس حاصل ہونا بدرجۂ اتم ضروری ہے؛ کیونکہ صاحب کشف عارفوں کی معرفت دلیل کی محتاج نہیں ہوا کرتی ہے بلکہ صاحب مکاشفہ عارف کے لئے دلیل محض اہل علم کی تفہیم کے لیے ہوتی ہے؛ یعنی بلا دلیل کے خدا کو پہچاننا اصل مکاشفہ ہے اس لئے جو محققوں کی کتابوں کے مطالعہ سے خود کو محقق جانتا ہے وہ آپ کے نزدیک نہ محقق ہے نہ موجد بلکہ وہ محض مقلد ہے۔

حضرت مجا قلندر کے مکتوبات کی ایک اہم افادیت یہ بھی ہے کہ ان میں بعض ایسے جملوں کی تفصیل بھی معلوم ہو جاتی ہے جو اہل علم کے نزدیک مختلف ہی رہے ہیں، جیسے ''الصلاۃ معراج المومنین'' کا جملہ جو مفہوماً تو حضرت رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نماز کے عین موافق ہے؛ البتہ کتب حدیث میں یہ جملہ منقول نہیں ہوا ہے صرف علامہ آلوسی اور نظام الدین نیشاپوری نے اپنی تفسیر میں جملۂ متذکرہ کو قول نبوی ﷺ کی صراحت کے ساتھ نقل کیا ہے، حضرت شاہ مجا قلندر کے ایک مکتوب میں اس تعلق سے یہ تصریح فرمائی گئی ہے کہ الصلاۃ معراج المومنین کا جملہ حدیث نہیں ہے بلکہ بزرگوں کا قول ہے۔

حضرت مجا قلندر کی مکتوبات توسع مضامین اور نکات عارفانہ کے لحاظ سے بھی بلند پایا مقام کے حامل ہیں یہی وجہ ہے کہ آپ کے مکتوبات کو مترجمین نے شیخ مجدد الف ثانی کے مکاتیب کے مشابہ قرار دیا ہے جن موضوعات کا احاطہ آپ کی دستیاب کل 26 مکتوبات کے مجموعے میں کیا گیا ہے، ان میں درویشوں کی خدمت اور اس کے فوائد، شیخ اکبر کی تفصیلات، اولیاء اللہ کی ہم نشینی، ارشاد وتلقین، فوائد ونصیحت، طالبین وکاسبین کے اوصاف وخصوصیات، مشغولی حق اخفائے راز، اتباع شریعت، عاجزی وانکساری، حقائق توحید، مقامات توحید، سلوک طریقت کے معارف ونصائح، کف لسان، اسرار الٰہی، وصال حق تعالی کی تاکید، تقدیر کا بیان، صوفیوں کے اوصاف، تسلیم حقائق ومعارف، تحصیل امور، علوم ظاہری کی تاکید، ارواح کا بیان، کعبۂ دل وکعبۂ آب وگل کی تفصیل، حقائق وجد وسماع، اولیاء اللہ کی معراج، استقامت وسعی وکوشش کی تعلیم، ھوالاول والآخر کا مفہوم، ما خلقت الجن والانس کا معنی اور نماز پنجگانہ کے فوائد جیسے عنوانات کے تحت اہم امور پر روشنی ڈالی گئی ہے، ضمن میں بزرگان دین کے واقعات اور ان کے اقوال سے متدل کی عملی تائید کی گئی ہے، قرآن وحدیث سے براہ راست استدلال کیے

گئے ہیں، امثال و اشارات کی روشنی میں فاضلانہ نکات بیان کیے گئے ہیں، ایک ایک مکتوب متنوع مضامین کا حامل ہے، ہر مکتوب میں متعدد خصوصیات ذکر کی گئی ہیں، عمومی خصوصیات کے لحاظ سے متعدد مکتوبات میں خاص طور پر نفسیاتی کرب اور پیچیدگی کا حل بیان کیا گیا ہے، مثلا حسد ایک ایسی بیماری ہے جس سے بسا اوقات انسانی فکر مکمل طور پر متاثر ہو جاتی ہے عمل کی راہ مزدود نظر آتی ہے، ایک مرید کو حضرت مجا قلندر کرب سے نجات کا نسخہ تجویز فرماتے ہوئے یوں نصیحت فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام جو اشرف المخلوقات تھے ان کی بہت سی خواہشات پوری ہوئیں اور بہت سی خواہشیں پوری نہ ہوئیں؛ پس ہماری اور تمہاری خصوصاً حاسدوں اور بدخواہوں کی کل خواہش کس طرح پوری ہو سکتی ہے؟ اس لئے اطاعت و عبادت اور ذکر و فکر میں مشغول رہنا چاہیے اور اپنے دل کو مضبوط رکھنا چاہیے کیونکہ اللہ تعالی نے جس شخص کو مقبول کیا وہ کبھی مردود نہ ہوگا اور جس کو اس نے مردود کیا وہ کبھی مقبول نہ ہوگا، اس لئے عمل صالح کے ساتھ انسان کو جمیعت خاطر اور دل کو قوی رکھنے کی کوشش کرنا ضروری ہے ہمیشہ حق تعالی کے ساتھ رہنا چاہیے کیونکہ جس کے واسطے خدا ہے اس کے واسطے سب کچھ ہے۔

بنظر غائر اس نصیحت پر غور کیا جائے تو یہ نصیحت انسانی زندگی میں پیدا تمام کرب و تکالیف کا بہترین حل اور ان کا مفید علاج ہے کہ انبیاء علیہم السلام جو اللہ کے مقرب بندے ہیں مشیت الٰہی کے آگے وہ بھی سر تسلیم خم رہے جب ان کی ہر ایک خواہش جو تمام تر اچھائیوں پر مشتمل ہوا کرتی تھی پوری نہیں ہوئی تو ایک بدخواہ اور حاسد شخص جس کی چاہت جو سراسر دوسروں کی بربادی ہوا کرتی ہے کس طرح پوری ہو جائے گی؟ البتہ کبھی کبھی حاسدین کے حسد کے نتیجے میں خدائے پاک ہمیں آزمائشوں سے گزارتا ہے تاکہ جو عمل میں کمی ہو وہ آزمائش پر صبر و استقامت کے ذریعے دور ہو جائے اور اللہ کی مشیت کے مطابق درجات و منازل کا حقدار بندہ بن سکے اس لیے حاسدین کی فکر کے بغیر عمل صالح پر مداوم رہ کر صبر و استقامت کے ساتھ کشادگی اور رحمت الٰہی کا طالب رہنا سالک طریقت اور ہر ایک مسلمان متلاشی حق کے لئے ضروری ہے۔

حضرت مجا قلندر کے مکتوبات کا اہم موضوع اتباع شریعت ہے چونکہ خود آپ کا شمار بھی صوفیائے سالکین میں ہوتا ہے اور صوفیہ سالکین کے یہاں طریقت سراپا شریعت سے مربوط ہے ظاہر و باطن میں اتباع شریعت کو ملحوظ رکھنے والا ہی صوفیا کے نزدیک صوفی کہے جانے کے قابل ہے؛ چنانچہ اتباع شریعت کے تحت بہت ساری کارآمد باتیں آپ کے مکتوبات میں جابجا مندرج ہوئی ہیں، جیسے سترہویں مکتوب میں صوفی کی تعریف کرتے ہوئے یوں فرماتے ہیں کہ معلوم ہونا چاہیے کہ جو کوئی صوفی ہوگا وہ ہرگز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کے دائرے سے باہر قدم نہ رکھے گا:

بود مرد آن که در حال تمامی کند با دواجگی کار غلامی

ساتویں مکتوب میں اس حوالے سے التزام عبادت و ریاضت پر زور ڈالتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ شریعت کو عین حقیقت جاننے کی علامت یہ ہے کہ ریاضت و مجاہدہ سے ایک لمحہ و لحظہ خالی نہ جائے اور شریعت سے بال برابر بھی قصداً تجاوز نہ کیا جائے جو درویش معرفت کا دعوی کرتا ہو اور معنی مذکور سے خالی ہو وہ محض دعوی کرنے والا اور جھوٹا اور بندہ اس سے معذور ہو مقہور ہے۔ معرفت کی تعریف کرتے

ہوئے اس کی خصوصیت کے تحت ایک اہم بات مکتوب ہفتم میں تحریر فرماتے ہیں کہ جس کسی کو معرفت زیادہ حاصل ہوتی ہے اس میں عجز و نیاز بھی زیادہ ہوتا ہے، سرور کائنات علیہ السلام باوجود اس کمال و جمال کے جو کسی فرشتہ اور نبی مرسل کو حاصل نہ تھا، فرائض کے بعد عجز و نیاز سے فرماتے کہ ما عبدناك حق عبادتك وماعرفناك كا حق معرفتك۔

معرفت میں اتباع شریعت کو اصل قرار دیتے ہوئے سالکین کو اتباع شریعت کی تلقین فرماتے ہیں کہ کل طالبوں اور سالکوں کا مقصود ومطلوب خداوند عالم کی معرفت ہے جب یہ حاصل ہوگئی تو کشف وکرامات کی کیا ضرورت ہے کیونکہ معرفت ہی عین کرامت ہے بلکہ کرامت سے بہتر اللہ تعالی تم کو شریعت کے راستے پر استقامت عطا فرمائے کوئی مرتبہ اس سے بلند نہیں کہ خدا کے حبیب کے مطابقت میسر ہوں (مکتوب ھفتم)۔صوفیانہ مشرب اور صالحین کی روش پر روشنی ڈالتے ہوئے مزارات صالحین پر حاضری کے فوائد پر روشنی ڈالی ہے، یہ حقیقت ہے کہ اہل اللہ کے مقابر پر حاضری اگر آداب شریعت کی رعایت کے ساتھ ہو تو یقینی فائدہ سے خالی نہیں ہوتی ہے چنانچہ سید العرفاء مکتوب چہارم میں مقابر صالحین پر حاضر ہونے کی تعلیم کے ساتھ اس سلسلے میں معمولات بیان کرتے ہوئے اس کا ایک فائدہ شیخ رکن الدین علاء الدولہ کے حوالے سے یوں تحریر فرماتے ہیں کہ ایک درویش نے شیخ رکن الدین علاالدولہ سے پوچھا کہ جب اس بدن کو خاک میں ادراک نہیں ہے اور بدن ایک ہے روح اس سے جدا ہوگئی اور عالم ارواح میں حجاب نہیں ہے، تو خاک پر یعنی قبر پر جانے کی کیا ضرورت ہے؟ شیخ نے فرمایا ہر چند کی روحوں کو حجاب نہیں ہے اور کل دنیا اس کیھی نزدیک یکساں ہیں، لیکن وہ جسم جو حشر کے بعد ہمیشہ قائم رہے گا اور جس نے سالہا سال روح سے محبت رکھی ہے اس قبر میں ہے اس لئے اس جگہ یعنی قبر میں روح کا تعلق اور اس کی نظر زیادہ ہوگی، نہ کہ دوسری جگہ، زیارت صالحین کے فوائد بہت ہیں جو بھی اس جگہ ذرا غور و توجہ کرے تو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت سے فائدہ پائے گا اگر مدینہ منورہ جاتا ہے تو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک اس کے سفر سے اور اس کی تکالیف سے باخبر ہوتی ہے جب آرام گاہ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر زائر پہنچتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس کو حس کے ساتھ دیکھتا ہے اور اس کی طرف پوری طرح متوجہ ہوتا ہے، تو اس توجہ اور اپنے گھر پر رہ کر توجہ میں بڑا فرق ہے۔(مکتوب چھارم)

اولیاء اللہ کی شناخت اور ان کے مراتب ومقامات کی معرفت ایک دشوار امر ہے، خاص طور پر جو درجۂ معشوقیت کو پہنچ چکے ہوں، اس لیے ان کی شناخت متعذر رہے بتقاضۂ بشریت ایک ولی کو دوسرے ولی کی شناخت میں اسہو ہوجانا عین ممکن ہے یہ خلاف ولایت امر نہیں ہے چنانچہ صاحب مکتوب فرماتے ہیں کہ ولی کو ولی نہ پہچانے تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ خضر علیہ السلام جو ولیوں کے نقیب ہیں سب کو نہیں پہچانتے وہ ان ولیوں کے نقیب ہیں جو عاشقان خدا ہیں، درجۂ معشوقیت کے فقراء کو سوائے خدا کے اور کوئی نہیں پہچان سکتا۔(مکتوب چھارم)

حضرت مجا قلندر کے مکتوبات میں مختلف مضامین کی تصریح میں صوفیۂ سالکین کے اوصاف اور ان کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں، جن کا یکجا طور پر بیان کرنا یقیناً مفید ہوگا ہے جو سالکین راہ طریقت کے ساتھ عامۃ المسلمین کے لئے بھی درس بصیرت ہیں حضرت مجا مرشدانہ نصائح فرماتے ہوئے اس حوالے سے رقیم ہیں کہ اہل تصوف کو چاہیے کہ ہمیشہ باوضو رہے اور جس وقت تازہ وضو کرے دو رکعت نماز نفل ادا کرے اور اگر تحیت

الوضونہ پڑھ سکے تو تین بار کہے سبحان اللہ والحمدللہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبرولاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

دوسری خصوصیت میں ارشادفرمایا کہ کوئی شخص کتنا ہی عابدوزاہد ومتقی ہو جب تک اپنے آپ میں ہے خدا سے دور ہے اور عبادت کی لذت سے محروم ہے۔

اے میرے بھائی پڑھنے کے پابندرہوکرم الٰہی کے پابندرہو کہ جلد پڑھ لو۔

اہل بصیرت سے جو کچھ تم دیکھو اس میں ہرگز شبہ وانکار نہ لاؤ،صاحب دلوں سے جو کچھ صادر ہوتا ہے وہ سب کچھ صحیح ہے لیکن جو اس گروہ کے نہیں ہیں لیکن اپنی صورت اس گروہ والوں جیسی بناتے ہیں ان کے لئے یہ سب افعال وبال جان ہوتے ہیں۔

کسی فقیر کو حاسدوں کے حسد اور منافقوں کے نفاق سے چارہ نہیں ہے،کوئی بزرگ نہیں ہوتا ہےجب تک اس پر کوئی حسد نہ کرتا ہو، جب کوئی صاحب نعمت ہوتا ہے تو ہر طرف حاسد اور منکر پیدا ہوتے ہیں،فقیر کو شکر ادا کرنا چاہیے کیونکہ محسود ہونا بڑا کام ہے جیسا کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہم اجعلنی محسوداً لا حاسداً۔اگر کوئی شخص کعبہ کا ارادہ کرے تو اسے لازم ہے کہ مردوں کے قدم پر چلے یعنی سب مرادوں اور مقصودوں کو ترک کرے تا کہ مردوں کے مقام پر پہنچے جب کوئی توفیق رفیق کے ذریعے معرفت کے کعبہ تک کو پہنچا وہی اصلی حاجی ہے۔

ریاضت ومجاہدہ اس لئے ہے کہ حقیقت حق سالک پر ظاہر ہو خدا کے واسطے خدمت وعبادت ذکر وفکر وغیرہ کرتے رہو خلقت خواہ قبول کرے یا رد،اس سے کچھ واسطہ نہ رکھو،اگر وہ دو تین احمق اور نالائق تمہارے منکر ہوں تو کوئی نقصان نہیں جبکہ ہم قند کی کان ہوں تو ان لوگوں کے انکار سے کڑوے نہیں ہو سکتے،خلقت کے طعنے کو مثل ہوا کے شمار کرو جب کتے بھونکنے کی آواز آسمانی چاند نہیں سنتا تو خدائی چاند یعنی خاصان خدا کب سنتے ہیں؟

المختصر یہ کہ حضرت مجا قلندر قدس سرہ کے مکاتیب اپنے عرفانی اور اصلاحی مضامین کے لحاظ سے اہم افادیت کے حامل ہیں،مکتوبات میں شیخ مجا کی نصیحتیں اپنی عمدگی اور تاثیر کے لحاظ سے نہایت ارفع اور بااثر ہیں جن پر عمل کرنا سالکین کے ساتھ عام مسلمین کے لئے بھی مفید و مؤثر ہیں۔

منابع:

احسن القصص؛عبدالباسط؛قلمی نسخۂ کتب خانہ بدریہ مجیبیہ

مجموعۂ مکتوبات شیخ مجا؛ مکتبہ مجتبائی لکھنؤ

ماہنامہ المجیب؛مختلف شمارے

☆☆☆

ادیبا خانم
ریسرچ اسکالر،شعبہ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،علیگڑھ

فارسی تذکرہ نگاری: متقدمین ومتأخرین کے معتمد تذکروں کا مبسوط جائزہ

تذکرہ عربی زبان کا لفظ ہے، جو زمانہء حاضر میں کئی معنوں میں آتا ہے، مثلاً یادداشت، ذکر، سرگزشت، دستاویز وغیرہ، قرآن قریم میں یہ لفظ نصیحت اور بیان وغیرہ کے معنی میں آیا ہے، معنوی لحاظ سے تذکرے کا مطلب ذکر ہے، لیکن اصطلاح میں تذکرہ ایسی کتاب کو کہتے ہیں جس میں مختلف شخصیات کے حالات اور کارنامے درج کیے گیے ہوں۔ ادب میں تذکرہ نگاری تاریخی اور تنقیدی دونوں لحاظ سینہایت اہم ہے۔اگر ادب میں تذکرے نہ لکھے جاتے تو ہم بہت سے کہنہ شعراء کیحالات اور انکے کلام سے غافل رہتے۔ ایسے بہت سے شعراء کہ جن کے نہ تو حالات واحوال سے کوئی واقف ہے اور نہ ہی ان کا کلام کتابی شکل میں دستیاب ہیبذریعہ تذکرہ تاریخ میں محفوظ ہوگئے ہیں اور تذکروں کی بدولت گمنام ہونے سے بچ گئے ہیں۔اس مقالے میں ہندوستان میں لکھے گئے چند اہم تذکروں کا مختصر تعارف پیش کیا جارہا ہے۔

لباب الالباب: تذکرہ لباب الالباب فارسی کا پہلا تذکرہ ہے، جسکو محمد عوفی نے تالیف کیا، عوفی نے اپنے تذکرے لباب الالباب کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے، پہلے حصہ میں ان شعراء، وزراء، علماء اور بادشاہوں کا تذکرہ پیش کیا ہے جنہوں نے کبھی کبھار ہی شعر کہے تھے۔اس جزو میں ۱۰۳۱ اشخاص کا ذکر ملتا ہے، یہ جزو کل ۷ ابواب پر مشتمل ہے۔دوسرے حصہ ان شعراء کے حالات پر مشتمل ہے کہ جن کا کام شاعری کے علاوہ کچھ اور نہ تھا، عوفی کے تذکرے سے پہلے بھی کچھ ایسی کتابیں تالیف ہوئیں تھیں کہ، جن کے زریعہ ہم بہت سے متقدمین شعراء کے کس قدر حالات سے وقفیت حاصل کر سکتے ہیں، مگر وہ سب تذکرے کی ذیل سے باہر ہیں۔اس کتاب کے خطی نسخے اسپرنگر، برلن اور لندن میں محفوظ ہیں، اس کے علاوہ یہ کتاب سب سے پہلے ای جی براون نیز تیب دیکر ۱۹۰۳-۱۹۰۶ میں لندن سے چھپوائی، سعید نفیسی نے بھی تصحیح کے ساتھ ۱۳۲۵ھ میں ایران سے شائع کی۔

ہفت اقلیم: یہ تذکرہ امین احمد رازی کا ہے، اسکی ولادت اور نشو ونما شہر رے میں ہوئی۔مولف نے تذکرہ ہفت اقلیم کو ۹۹۶ھ-۱۰۰۱ھ/۱۵۸۸ء-۱۵۹۴ء میں تالیف کیا تھا، تذکرہ ہفت اقلیم کو مولف نے الگ الگ جگہوں کے جغرافیای اور تواریخی حالات پر محیط کیا ہے، اور اس میں تقریباً شاعری کرنے والے ۱۵۶۰ شعراء وفضلاء سلاطین وعرفاء اور امراء کے احوال وکلام کو قلم بند کیا گیا ہے۔ مولف نے رہائشی علاقوں کو نظر میں رکھتے ہوئے اس کتاب کو سات اقلیموں میں منقسم کیا ہے، اور اس میں احمد نگر، دولت آباد، گولکنڈ، احمد آباد، سورت، بنگال، اڈیسہ اور کوچ وغیرہ کا حال بھی لکھا ہے۔اس کے علاوہ اس تذکریمیں ہندوستان کی تاریخ بھی ابتدائی دور سے لے کر کے عہد آخر

تک مرقوم ہے، اس ہی وجہ سیرازی کا یہ تذکرہ جغرافیہ اور تاریخی اعتبار سے ہی نہیں بلکہ شعراء اور فضلاء کے حالات کیباعث سے بھی لائق تکریم ماخذوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ کتاب محمد اسحاق نے ترتیب دیکر کلکتہ کے روپا سری مطبع سے ۱۳۸۳ھ میں شائع کی۔

عرفات العاشقین: اس معروف تذکرے کا مولف تقی الدین محمد الحسینی الاوحدی ہے۔۱۰۲۲ھ میں اس نے عرفات العاشقین کو لکھنا شروع کیا اور ۱۰۲۴ھ میں اسکا تذکرہ اختتام کو پہنچا، مولف نے اس میں تقریباً تین ھزار ایک سو پچانوے شعراء کے تخلص یا ناموں کو بہ ترتیب حروف تہجی درج کیا ہے، اس میں ذکر کردہ شعراء کی مقدار تقریباً تین ہزار دوسو بتائی جاتی ہے اور ہر ذکر شدہ شعراء کو اسکے نام کے حروف کے متعلق ایک جز قرار دیا ہے۔جس جز کے لیے اوحدی "عرصہ" لفظ کو عمل میں لایا ہے، اس کتاب کو اسنے اٹھائس "عرصہ" پر موقوف کیا ہے جسکا ہر عرصہ تین غرفہ پر محیط ہے، پہلے عرصے میں قدیم دور کیشعراء کا ذکر کیا ہے عرصہ دوم میں متوسطین شعراء کے حال وکلام کو درج کیا ہے، عرصہ سوم میں متاخرین یعنی جدید شعراء کے حالات وواقعات قلم بند کئے ہیں، حبیب گنج کلکشن علیگڑھ میں اس کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے۔اس کے علاوہ پٹنہ اور حیدرآباد کے کتب خانوں میں بھی اسکے نسخے موجود ہیں۔

کلمات الشعراء: اس تذکرے کا مولف "مرزا میاں محمد افضل" ہے اور وہ سرخوش تخلص اختیار کرتا تھا، سرخوش نے سرھند میں اپنی آنکھیں کھولیں اور اسکی نشو ونما یہیں ہوئی۔اس تذکرے کو "تذکرہ سرخوش" بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ سرخوش نے اس میں شعراء کے سوانح عمری کو اپنی وقفیت اور معلومات کے تحت درج کیا ہے، ہاں مگر کچھ بیاضات سے ضرور استفادہ کیا ہے۔ یہ تذکرہ ۱۶۹ شاعروں کے حالات وکلام پر محیط ہے اور اس میں الہی ہمدانی سے لے کر یحی کاشانی تک کے شعرا کا تذکرہ قلم بند ہے۔لیکن موالف نے سالِ ولادت اور وفات لکھنے کا احتیات نہیں کیا ہے اور کہیں کہیں شعراء کے ذکر کے ساتھ اس نے کچھ غیرضروری حکایتیں بھی درج کردی ہیں۔اس کے باوجود بھی ذاتی علم پر موقوف ہونے کی وجہ سے سرخوش کے بیانات کی اہمیت بہت ہے۔ یہ کتاب صادق علی دلاوری نے ترتیب دیکر مفصل مقدمے کے ساتھ لاہور سے ۱۹۴۲ء میں شائع کی۔

ہمیشہ بہار: اس تذکرے کا مولف کشن چند اخلاص ہے، اس کا تعلق جہان آباد دہلی سےتھا۔تذکرہ ہمیشہ بہار میں مولف نے ۳۰۷ شاعروں کے احوال اور ان کے کلام کے انتخاب کو جمع کر کے ان کے تخلصوں کو حروف تہجی کی ترتیب سے مرتب کیا ہے۔اس تذکرہ کو کشن چند نے ۱۱۳۶ھ/ ۱۷۲۳ء میں تالیف کیا تھا، اس تذکرے کو مولف نے جہانگیر بادشاہ کے دورِ حکومت سے محمد شاہ بادشاہ کے سالِ جلوس تک کہ شاعروں کے ذکر پر موقوف کیا ہے۔ البتہ اس میں چند شعراء ایسےبھی شامل کر لیے ہیں جن کا تعلق اکبر بادشاہ کے دور سے تھا۔اخلاص کا یہ تذکرہ "امیر خان انجام" سے شروع ہوتا ہے اور "احمد یار خان" پر اختتام کو پہنچتا ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر وحید قریشی نے ترتیب دے کر مفصل مقدمے کے ساتھ انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالہ اردو کراچی سے شائع کی۔

مقالات الشعراء: اس تذکرے کا مولف قیام الدین حیرت اکبرآبادی ہے، اس تذکرے میں مولف نے اپنی عمر ۳۰ سال بتائی ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حیرت ۱۱۴۳ھ میں اکبرآباد میں پیدا ہوا ہوگا۔اس تذکرے میں مولف نیتقریباً ۱۹۵ ایسے فارسی شعراء کا مختصر تذکرہ

کلام کے ساتھ درج کیا ہے جو اورنگ زیب کے دور کے آخر سے لے کر کیعالمگیر ثانی کے عہد تک ہندوستان میں موجود تھے۔ کچھ شعراء تو خالص ہندوستان کے ہی ہیں اور جو باہر سے ہجرت کر کے آئے تھے وہ بھی اس تذکرے میں شامل کر لئے ہیں، اس کتاب میں حیرت نے جن بھی ہندی نثر نگار و شعراء کو شامل کیا ہے، ان سب کو تذکرہ سفینۃ الشوق سے لکھا ہے مگر اب وہ تذکرہ وجود میں نہیں ہے اس ہی وجہ سے مقالات الشعراء کی اہمیت اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہے، باقی ایرانی شعراء کے حالات اور کلام کے لیے ریاض الشعراء اور مجمع النفائس سے مدد لی ہے۔ یہ کتاب نثار احمد فاروقی نے ترتیب دے کر مفصل مقدمے کے ساتھ علمی مجلس دہلی سے ۱۳۷۳ھ میں شائع کی۔

سفینہ خوش گو: اس تذکرے کو بندرابن داس نے تالیف کیا ہے، اس نے اپنا تخلص خوشگو اختیار کیا تھا۔ خوشگو نے اس تذکریکو شاعروں کے سالِ ولادت اور وفات کے لحاظ سیمرتب کیا ہے، اور اپنے تذکرے سفینہ خوشگو کو تمام کرنے کے بعد موافقت کے لیے خان آرزو کی خدمت میں پیش کیا، چنانچہ آرزو نے دیباچے اور شعرائکے احوال وکلام میں بعض اضافے بھی کیے تھے۔ اس تذکرے کو مولف نے تین دفتر میں منقسم کیا ہے۔ تیسرے دفتر میں شاعروں کے حالات زیادہ تفصیل سے درج کیے ہیں، کیونکہ زیادہ تر شعراء سے مولف کی جان پہچان تھی اور ان کے ساتھ مشاعروں میں شرکت بھی کی تھی۔ اس کے علاوہ خوشگو نے دفتر اول اور دفتر دوم کی تکمیل کے لیے بھی اکثر محترم مآخذ سے نظر ثانی کی ہے، مثال کے طور پر کلمات الشعرا، تذکرہ نصر آبادی، تذکرہ آزاد، ہمیشہ بہار اور تذکرہ والہ اور درست ترین معلومات پیش کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ یہ کتاب عطا کاکوی نے ترتیب دے کر مفصل مقدمے کے ساتھ لیتھو پریس، پٹنہ سے ۱۹۵۹ء میں شائع کی۔

ید بیضا: اس تذکرے کو میر غلام علی آزاد نے تالیف کیا، ان کا پورا نام حسان الہند میر غلام علی آزاد ابن سید نوح حسینی ہے۔ ان کی ولادت ۱۱۱۶ھ میں قصبہ بلگرام ہوئی، اسی مناسبت سے وہ بلگرامی تخلص بھی اختیار کرتے تھے۔ تذکرہ ید بیضا میں آزاد بلگرامی کے علمی کمالات کا ذوق ابھر کر نہیں آسکا ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ ید بیضا ان کا پہلا تذکرہ تھا۔ یہ تذکرہ ویسے تو ۱۱۴۵ھ میں مکمل ہو چکا تھا، مگر آزاد بلگرامی نے ۱۱۴۸ھ میں تصحیح کر کے اس کتاب میں مزید اضافے کیے۔ آزاد نے اپنے اس تذکرے کو ۵۳۵ متقدمین اور متاخرین شاعروں کے احوال پر محیط کیا ہے، اس میں شاعروں کے تخلصوں کو حرف تہجی کے لحاظ سیترتیب دیا گیا ہے۔ یہ تذکرہ ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے، اس کے تین قلمی نسخے آزاد لائبریری علیگڑھ میں موجود ہیں اس کے علاوہ بانکی پور میں، انڈیا آفس لائبریری میں بھی اسکے نسخے موجود ہیں۔

تذکرہ ندرت: اس تذکرے کو عطائاللہ علی فطرت نے تالیف کیا، وہ اپنا تخلص ندرت اختیار کیا کرتیتھے، مگر مشہور دانشور خان کے نام سے تھے۔ مولف نے یہ تذکرہ ۱۱۴۹ھ میں یعنی محمد شاہ بادشاہ کے انیسویں سال جلوس کے وقت تمام کیا تھا۔ یہ تذکرہ دو چمن، سات گلشن اور ایک حدیقہ میں محیط ہے۔ یہ شاعروں کا ایک عام تذکرہ ہے، مولف نیپہلے چمن میں تیسری صدی ھجری کے شعراء یعنی رودکی سے لے کر کے عماد مروزی تک کہ حالات قلم بند کیے ہیں اور دوسرے چمن میں چوتھی صدی ہجری کے شعراء یعنی امیر آغاجی سے لے کر کے آقاجی ابولفرج تک کے حالات وکلام کو درج کیا ہے۔ سات گلشنوں میں پانچویں صدی سے گیارھین صدی ھجری تک

کے شاعروں کا حال لکھا ہے۔حدیقہ جسے خاتمہ بھی کہہ سکتےہیں بارھویں صدی ہجری کے ہم عصر شعراء کیا حوال پر محیط کیا ہے۔

بہارستان سخن: میر عبدالرزاق کا یہ تذکرہ ایک مختلف اہمیت کا حامل ہے،عبدالرزاق کوصمصام الدولہ کیخطاب سے نوازہ گیا تھا۔چار کتابیں تھیں جوصمصاالدولہ نے اپنی زندگی کے ایام میں لکھیں، بہارستان سخن انہیں میں سے ایک ہے،اس تذکرے کی تالیف کیسلسلے میں مولف اس طرح لکھتاہیکہ "جس وقت وہ کتاب "فوایدالفواید" لکھ رہاتھا،ایک فصل جوازشعر میں لکھنی شروع کی، بحث طلب امور نکلتے گئے اور آخر میں ایک الگ کتاب کی صورت اختیار ہوگئی،جس کا نام بہارستان سخن رکھ دیا۔ویسے صمصام الدولہ نے اس کتاب کو۱۱۶۰ھ میں لکھنا شروع کیا تھا،مگر اس کو نامکمل چھوڑ کر دنیا سے چلا گیا، پھراس کے بیٹے نے۱۱۹۲ھ میں اس کتاب کو تمام کیا تھا۔اس کتاب کیخطی نسخے کتابخانہ دولت مدراس اور کتابخانہ آصفیہ حیدرآباد میں موجود ہیں۔اس کے علاوہ یہ کتاب ۱۹۵۸ م میں مدراس سے شائع بھی ہوئی ہے۔

ریاض الشعراء: علی قلی خان بہادر نے ایک تذکرہ تالیف کر کے اس کا نام ریاض الشعراء رکھا، اس کا شمار اپنے عہد کے معروف تذکرہ نویسوں میں ہوتا تھا،تخلص والہ تھا۔تذکرہ ریاض الشعراء کی ابتداوالہ نے ۱۱۶۰ھ میں کی تھی اور ایک سال کے اندر اسکو تمام کردیا، ابو الحسن خرقانی کے ذکر سے یہ تذکرہ شروع ہوتا ہے اور یحی خان کے حالات پر اس کا ختمہ ہوجاتا ہے۔والہ نے اس تذکرے میں دو ہزار پانچ سو قدیم اور جدید شعراء کے احوال کو بہ ترتیب حروف تہجی سیقلم بند کیا ہے۔یہ ایک مقدمہ،اٹھائیس روضہ اور ایک خاتمہ پرموقوف ہے، ہر روضے میں ایک ہی حروف کے شعراء کے احوال اور کلام کو درج کیا گیا ہے،اس کتاب میں والہ کا طرز تحریر عموماً سادہ اور بے تکلف ہے۔پنجاب یونیورسٹی نے اس تذکرے کو چھپوا بھی دیا ہے۔اس تذکرے کو شریف حسین قاسمی نے مرتب کر کے ایک مفصل مقدمے کے ساتھ رام پور سے ۲۰۰۱ میں شائع کیا۔

تذکرہ حسینی: اس تذکرے کے مولف کا نام میر حسین دوست اور حسینی تخلص اختیار کرتے تھے،تذکرۃ حسینی ان کا ایک بہترین کارنامہ ہےجس میں چارسو پینتالیس ابتدائی اور آخری شاعروں کے نام وکلام کو حروف تہجی کے اعتبار سے قلمبند کیا ہے۔یہ کتاب شیخ ابو الحسن خرقانی سے شروع ہوتی ہے اور یوسفی خراسانی پر ختم ہوجاتی ہے۔اس کے آغاز میں حضرت علی کی توصیف وفضائل بیان کرتے ہوئے مناقب اور ایک حکایت نقل کی ہے،مولف نے اس کتاب کی تالیف میں استعمال ہونے والے ماخذ کے نام نہیں بتائے ہیں نہ ہی دیباچے میں اور نہ ہی شعراء کے سوانح حال کے نیچے، یہاں تک کہ ماخذ کا ذکر کیے بغیر ہی اشعار کے ذیل میں قصہ اور کہانیاں نقل کردی گئی ہیں۔یہ کتاب مطبع نول کشور لکھنو سے ۱۸۷۵ء میں شائع ہوئی ہے، ڈاکٹر کشور جہاں زیدی نے اردو ترجمہ وترتیب کر کے اس تذکرے کو ۲۰۰۸ میں شائع کروایا۔

مجمع النفائس: اس تذکرے کے مولف کا نام سراج الدین علی خان اور آرزو تخلص تھا ، استعداد خان کا لقب ملا ہوا تھا، یہ تذکرہ ابویزید بسطامی سے شروع ہوتا ہے اور محمد اشرف یکتا کشمیری پر ختم ہوجاتا ہے، اور اس میں مقدمین،متوسطین اور متاخرین

شعراء کے تقریباً ۴۰ ہزار اشعار درج کئے گئےہیں ۔اکثر شعراء کے احوال مختصر ہی بیان کئے ہیں مگر قریب ۱۵۰ شاعروں کے ناموں کے ذیل میں انکے حالات تفصیل سے قلمبند ہیں اور ان کی زندگیوں کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔ جیسے آرزو، بدیل، جامی اور اوحدی وغیرہ۔ یہ کتاب عابد رضا بیدار نے ترتیب دے کر ایک مفصل مقدمے کے ساتھ خدا بخش لائبریری پٹنہ سے ۱۹۹۲ء میں شائع کی۔

تذکرۃ المعاصرین: اس تذکرے کے مولف کا نام شیخ جمال الدین ابوالمعالی محمد علی اور حزین تخلص تھا، مولف نے یہ تذکرۃ ۱۱۹۵ھ کے آخر میں تالیف کیا، یہ کتاب اصفہان کے ۱۰۰ شعراء، علماء، فضلاء اور بزرگوں کے تذکرے پر مشتمل ہے، جو مولف کے ہم عصر تھے، مولف نے اس تذکرے میں کوئی خاص ترتیب استعمال نہیں کی ہے نہ حروف تہجی، نہ تاریخی، اور نہ ہی جغرافیائی ترتیب ہے۔ یہ تذکرہ تین فرقوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب معصومہ سالک نے ترتیب دے کر ایک مفصل مقدمے کے ساتھ تہران سے ۱۳۷۵ء میں شائع کی۔

خزانہء عامرہ: اس مشہور تذکرے کو مولانا آزاد بلگرامی نے تالیف کیا ہے، آزاد نے یہ کتاب ۱۱۷۶ھ سے ۱۱۷۸ھ کے درمیان میں لکھی تھی، اس کتاب میں ان شاعروں کے حالات وکلام کو لکھا ہے جن کو کسی نہ کسی مقام پر انعامات حاصل ہوئے تھے، اس میں تذکرے میں آزاد نے عہدِ متقدمین سے لے کر کے عہد حاضر تک کہ ایک سو پینتیس شاعروں کے احوال وکلام کو قلم بند کیا ہے جو انوری سے شروع ہو کر یوسف بلگرامی پر ختم ہوجاتا ہے۔اس تذکرے کا ایک قلمی نسخہ مولانہ آزاد لائبریری علیگڑھ میں سبحان اللہ کلکشن میں موجود ہے، یہ کتاب نول کشور، کانپور سے ۱۹۰۰ء میں چھپ چکی ہے۔

مخزن الغرائب: اس تذکرے کے مولف کا نام شیخ احمد علی ہاشمی سندیلوی ہے جو محمد حاجی کا بیٹا تھا اور خادم تخلص اختیار کرتا تھا۔مخزن الغرائب میں مولف نے ۳۱۳۸ شعراء کے احوال وکلام کو درج کیا ہے، جنہیں ان کے پہلے حروف کے مطابق یعنی حروف تہجی کی ترتیب سے مرتب کیا ہے۔لیکن بعض تخلص خلاف ترتیب مذکور ہیں، مخزن الغرائب سب سے بڑے تذکروں میں سے ایک ہے، مولف نے مخزن الغرائب کی تالیف کے لیے تقریباً ۸۱ کتابوں سے مدد لی ہے۔ یہ کتاب محمد باقر نے ترتیب دیکر ایک مفصل مقدمے کے ساتھ یونیورسیٹی اورینٹل کالج لاہور، سے ۱۹۶۸ میلادی میں شائع کی۔

سفینہء ہندی: اس تذکرے کا مولف بھگوان داس ہندی بسمل ہے، اس کی زندگی اور ادبی کارناموں کے بارے میں معلومات کے ذرائع سفینہ ہندی ہی ہے جہاں اس نے اپنی زندگی کے مکمل احوال درج کئے ہیں۔ یہ تذکرہ فارسی شاعروں کا ایک بہترین تذکرہ ہے جس میں مولف نے ان شاعروں کے کلام اور احوال کو درج کیا ہے جو شاہ عالم کے عہد حکومت میں پروان چڑھے اس تذکرے کو مولف نے ۱۲۱۹ھ میں مکمل کیا اور اس میں مولف نے ۳۳۷ شعراء کے احوال اور کلام کو حروف تہجی کی ترتیب سے قلمبند کیا ہے، جس میں سے بیشتر شعراء بھگوان داس ہندی کے ہمعصر تھے جن کے احوال سے مولف بخوبی واقف تھا۔اس تذکرے کے بیشتر شعراء نے اردو میں بھی شاعری کی جس کی وجہ سے یہ تذکرہ اردو ادب کے طلبہ کے لیے بھی یکساں اہمیت کا حامل ہے۔ یہ کتاب، عطا کاکوی نیمرتب کر کے ایک مفصل مقدمہ کے ساتھ لیبل لیتھو پریس، پٹنہ سے، ۱۹۵۸ میلادی میں شائع کی۔

ریاض الوفاق: اس تذکرے کا مولف ذوالفقار علی مست ہے، اس نے اپنے اس تذکرے میں اردو اور فارسی شعراء کے مختصر حالات کو درج کیا ہے۔ ذوالفقار علی سے متعلق زیادہ اطلاعات حاصل نہ ہوسکی ہیں، اس تذکرے میں مولف نے بنارس اور کلکتہ کے ان شاعروں کے احوال کو درج کیا ہے جنہوں نے صرف فارسی اور اردو ہی میں شعر کہے ہیں، اور ان میں بیشتر تو مولف کے ہم آشنا تھے۔ بقول مولف "این تذکرۃ احبّا وگل رعنای اصدقا است" مصنف نے یہ تذکرہ ۱۲۲۹ھ میں مکمل کیا۔ یہ تذکرہ ۴۶ صفحوں کے ایک دراز مقدمہ سے شروع ہوتا ہے جس کی طرز تحریر نہایت خوش طبع اور مصنوعی ہے، شاعروں کے تعارف کے لئے بھی مولف نے بہت متکلف اور تفصیلی عبارت استعمال کی ہے۔ اس تذکرے کے خطی نسخے اسپرنگر اور برلن میں محفوظ ہیں، اس کتاب کو عطا کاکوی نے تصحیح وتدوین کے ساتھ دائرہ ادب پٹنہ سے ۱۹۶۷ میلادی میں شائع کیا۔

تذکرہ صبح گلشن: اس تذکرے کا مولف نواب سید محمد حسن خان سلیم ہے، تذکرہ صبح گلشن مولف کی ایک بہترین تصنیف ہے۔ والد کا نام نواب صدیق حسن خان تھا۔ یہ جان کر بہت حیرانی ہوتی ہے کہ جس وقت مولف نے یہ تذکرہ مرتب کیا، اس کی عمر صرف گیارہ سال ہی تھی۔ مولف نے فارسی شعراء کے تذکروں سے اردو ادب کو واقف کرانے کے لیے تذکرہ صبح گلشن مرتب کیا، اس کو مولف نے ۱۱۹۴ھ میں مکمل کیا اور ۱۱۹۵ھ میں بھوپال سے چھپ بھی چکا ہے۔ یہ کتاب فارسی شاعروں کے ترجموں پر محیط ہے، اور اس میں تقریباً دو ہزار شعراء کے تراجم کو شامل کیا گیا ہے۔ اس تذکرے کو عطا کاکوی نے مرتب کرکے دی آرٹ پریس سلطان گنج پٹنہ سے ۱۳۸۷ شمسی میں شائع کیا۔

تذکرۃ روز روشن: اس تذکرہ کا مولف محمد مظفر حسین صبا ابن مولوی یوسف علی خلف مولوی یعقوب علی ہے۔ بارہویں صدی کے آخری دس سالوں میں جو فارسی شعراء کے تذکرے مرتب ہوئے ہیں، ان میں روز روشن بھی شامل ہے۔ اس تذکرے کو مولف نے ۱۲۹۵ھ تالیف کرنا شروع کیا اور ۱۲۹۶ھ میں مکمل کردیا، یہاں تک کہ ۹۰۰ صفحات پر مشتمل یہ تذکرہ ۱۲۹۷ھ میں بھوپال سے شائع ہوا۔ اس تذکرے میں مولف نے تقریباً ۲۴۶ فارسی گوشعراء کے تراجم کو درج کیا ہے، بہت تفشیش کے بعد اس میں سے ۱۴۳ شعراء ایسے نکل کر آئے ہیں جن کو اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں عبور حاصل تھا۔ یہ تذکرہ عطا کاکوی نے ترتیب دے کر ایک مفصل مقدمے کے ساتھ، رئیس ادارہ تحقیقات عربی وفارسی، پٹنہ سے ۱۳۸۸ھ میں شائع کی۔

حدیقہ عشرت: اس تذکرے کی مولف کا نام" کنور درگا پرساد" ہے اور وہ مہر سندیلوی تخلص اختیار کرتا تھا، مولف نے یہ تذکرہ ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء میں تالیف کیا، اسنے کتاب کے دیباچے میں یہ تذکرہ نہایت مصنوعی نثر میں لکھنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ وہ ایک عرصے سے متقدمین اور متاخرین کے اشعار کا مطالعہ کررہا تھا کہ مطالعہ کے دوران اسیشاعرات کے چند اشعار نظر آئے، پھر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک مختصر تذکرہ مرتب کرے۔ اس تذکرہ میں مولف نے ۵۹ متقدمین اور متاخرین شاعرات کا ذکر بہ ترتیب حروف تہجی درج کیا ہے، اکثر شاعرات کے حالات بیان کرنیمیں مولف نے نہایت اختصار سے کام لیا ہے، اور پھر ان کے ذکر کے ساتھ ان کے دو یا

تین شعر بھی لکھے ہیں۔اس کتاب کے قدیم شائع شدہ نسخے کتاب خانہ سالار جنگ اور رامپور رضا لائبریری میں محفوظ ہیں، اکثر و بیشتر نسخوں میں صفحات نکل گئے ہیں یا دیمک زدہ ہیں جس وجہ سے مکمل معلومات ملنے میں پریشانی ہوتی ہے، لہٰذہ کتاب کی حالت کو دیکھ کر اور اس کی اہمیت کا اندازہ لگانے کے بعد اسے دوبارہ ترتیب دیا گیا۔اس کتاب کو احمد نوید یاسر ازلان حیدر نے ترتیب دے کر ایک مفصل مقدمے کے ساتھ مرکز تحقیقات فارسی دانشگاہ اسلامی علیگڑھ سے ۲۰۱۸م میں شائع کیا۔

کتابیات:

1- تذکرہ نویسی فارسی در ہندو پاک، علی رضا نقوی، موسس مطبوعاتی علمی، تہران، ۱۳۴۷ شمسی

2- تاریخ تذکرہائے فارسی، احمد گلچی معانی، کتابخانہ سنائی، ۱۳۶۳ شمسی

3- مقالات الشعراء، قیام الدین حیرت، بہ تصحیح نثار احمد فاروقی، علمی مجلس دہلی، ۱۱۷۴ھ

4- مخزن الغرائب، شیخ احمد علی خان ہاشمی سندیلوی، بہ تصحیح وتوضیح محمد باقر، لاہور، ۱۹۶۸ میلادی

5- سفینہ ہندی، مرتب عطا کاکوی، لیبل لیتھو پریس، پٹنہ ۱۹۵۸ میلادی

6- ریاض الوفاق، ذولفقار علی مست مرتبین سید حسن، عطا کاکوی، دائرہ ادب پٹنہ، ۱۹۶۷ میلادی

7- صبح گلشن، مترجم، عطا کاکوی، دی آرٹ پریس سلطان گنج پٹنہ، ۱۳۸۷ شمسی

8- روز روشن، مترجم عطا کاکوی، رئیس ادارہ تحقیقات عربی وفارسی، پٹنہ، ۱۳۸۸ شمسی

9- حدیقہ عشرت، درگا پرساد مہر، مرتب، احمد نوید یاسر، مرکز تحقیقات فارسی علیگڑھ، ۲۰۱۸ میلادی

☆☆☆

ANWAR-E-TAHQEEQ

(Multiligual & Multidisciplinary Peer Reviewed Refereed Monthly Magezine from

Qila-e-Golconda, Hyderabad, Deccan)

Volume:-9, Issue:-1 to 6 January to June 2022

Price: Monthly:-100rs., Annual:- 1000rs.

Supervision: **Syed Adil Ahmad**, Depart. of Archaeology,State Museum, Hyderabad Telangana

Honorary Editors

Prof. Sahebzada Saulat Ali Khan, Principle, Govt. Girls PG College, Piplu, Tonk (Rajasthan)

Prof. E A Haidari, Retired Principle, Govt. Girls College, Nagar Fort, Tonk (Rajasthan)

Editor: **Syed Iliyas Ahmad Madni,**

Address:-

9-10-389, Neem Bowli, Masjid, Kathora House, Golconda Fort, Hyderabad,

Telangana- 500 008

Mob:- 09966647580/ 09667489768 Email:- anwaretahqeeq@gmail.com

Editorial Board

Prof. S M Asad Ali Khursheed, Aligarh

Prof. Shaid Naukhez Azmi,Hyderabad

Dr. Mohd. Aqeel, Varanasi

Dr. Mohd. Ehteshamuddin, Aligarh

Dr. Mohd. Qamar Alam, Aligarh

M. Tauseef Khan Kaker,Aligarh

Dr. Ahmad Naved Yasir, Aligarh

Sheikh Abdul Raheem, JIH, Hyderabad

Mutabbi Ali Khan, Daily Munsif, Hyderabad

Review Committee

Prof. Masood Anwar Alavi, Aligarh

Prof. Umar Kamaluddin, Lucknow

Prof. Azeez Bano, Hyderabad

P. Anuradha Reddy, Intex, Telangana, Hyderabad

Dr. Zareena Perveen, Director of Archieves, Hyd.

Dr. S. Asmath Jahan, Hyderabad

Dr. M. A. Naeem, Hyderabad

M.A. Ghaffar, caleographer, AIwan-e-Urdu, Hyd.

Kishore Jhunjhunwala, Expert of coins, Mumbai

Amarbeer Singh, Expert of coins, Hyderabad